نذر کئے ہیں، پھر اپنا ایک خاص انداز میں تعارف کرایا ہے، انتساب کے شعروں کے لئے اقبالؔ اور تعارف کے لئے غالبؔ کی زمینیں منتخب کی ہیں، جو ان کی خوش مذاقی کا ثبوت ہے، یہ مجموعہ نظموں، غزلوں، قطعات، متفرق اشعار، دوہے اور ڈوئٹ (گیت)، متنوع اصناف سخن پر مشتمل ہے، غزلوں کا حصہ زیادہ جاندار ہے، ان میں جابجا جدت و تازگی کے نمونے ملتے ہیں، مصنف نے عموماً نئی اور مشکل زمینوں میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے، ان کی جدید شاعری پر بھی نظر ہے اور انھوں نے اردو کی کلاسیکل شاعری کا بھی مطالعہ کیا ہے، اس لئے ان کے کلام میں دونوں کا حسین امتزاج ہے، اور وہ موجودہ دور کا عکاس بھی ہے، ان کے یہاں نئے الفاظ و استعاروں، نئی ترکیبوں و تشبیہوں اور جدید علامتوں اور رموز کے ساتھ ہندی زبان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں، کلام کے دوسرے حصے بھی قابل توجہ ہیں، نظموں سے ان کی قدرت کلام، احساسات کی شدت اور مشاہدے کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، ان میں طویل، مختصر، آزاد اور پابند ہر طرح کی نظمیں ہیں، اردو میں اب دوہے کہنے کا رواج بڑھ رہا ہے، عرفی صاحب نے اس میں بھی نیا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی شاعری فکری گہرائی و معنویت کی حامل ہے جس میں لب و لہجہ کی جدت نے ایک مخصوص کیفیت پیدا کر دی ہے، کتاب ظاہری حیثیت سے بھی دیدہ زیب ہے۔

فیوضات وزیریہ: مرتبہ مولانا وجیہ الدین احمد خاں قادری، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۳۰۴، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ وزیریہ، محلہ انگوری باغ رامپور، یوپی۔

رامپور کے صوفی مولانا وجیہ الدین احمد خاں کے ملفوظات کو ان کے نواسے مولوی وجاہت اللہ خاں صاحب نے قلمبند کیا ہے اور مصنف کے مرشد مولانا وزیر محمد خاں مرحوم کے نام پر اس کا نام فیوضات وزیریہ رکھا ہے، اس میں تصوف کے اشغال و اعمال اور اوراد و وظائف کے علاوہ سلسلہ قادریہ مجددیہ جمالیہ کے ختمہائے معمولہ اور اس سلسلہ کے منظوم و منثور شجرے بیان کئے ہیں، شروع میں مصنف کے اور آخر میں ان کے شیخ کے حالات درج ہیں، اس میں اسلامی تصوف کے ساتھ مروجہ تصوف کی بھی بہت سی باتوں کا ذکر اور دیوبندیت و وہابیت پر چھینٹے بھی ہیں، اس سے مصنف کے خیال و مسلک کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب غیر مستند واقعات اور صوفیانہ شطحیات سے بھی خالی نہیں ہے، مثلاً ۹۰ پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا جو الہام نقل کیا ہے وہ اخبار الاخیار میں شیخ کے تذکرہ میں نہیں ملا۔

"ض"

جلد ۱۳۴ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۴ء عدد ۳

مضامین

ایک ضروری اطلاع

کاغذ کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے دارالمصنفین کی مطبوعات کی قیمت میں یکم اکتوبر ۸۴ء سے بیس فی صدی کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور معارف کا سالانہ چندہ بھی جنوری ۸۵ء سے ہندوستان کے لئے تیس روپئے اور بیرون ہند کے لئے ساٹھ روپیہ کر دیا گیا ہے، امید ہے کہ دارالمصنفین اور معارف کے قدر داں اس معمولی اضافہ کو بطیب خاطر گوارا کریں گے۔

منیجر

شذرات

گذشتہ مہینہ کے شذرات میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے نامور مورخ سر جدوناتھ سرکار نے اپنی ساری تصانیف یا تو انگریزوں کے اشارہ سے یا ان کی خوشنودی کی خاطر لکھیں۔

ان کی تاریخ نویسی کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اپنے زور بیان میں ایک جگہ جو کچھ کہہ جاتے ہیں، دوسری جگہ ان کی تحریر کی روانی سے اس کی تردید بھی ہو جاتی ہے، جس کا احساس ان کو نہیں رہا، ان کی تضاد بیانوں کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں سے کچھ کی طرف توجہ ان سطروں میں دلائی جا رہی ہے، وہ بہت ہی پر زور طریقہ پر لکھ گئے ہیں کہ ایک مذہب (یعنی اسلام) جو اپنے پیرووں کو ڈاکہ زنی اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو، وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۳، ص ۲۴۸-۲۴۷)

یہ کیسی اشتعال انگیز تحریر ہے، مگر آگے چل کر ہندوستان ریویو کے اپریل ۱۹۲۹ء کے ایک مضمون "اسلام ان انڈیا" میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کو مسلمانوں نے یہ چیزیں دیں (۱) اپنی حکومت کے زمانے میں انھوں نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے (۲) ان کی وجہ سے ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں امن و سکون قائم ہوا (۳) ایک نئی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک میں یکسانیت پیدا ہوئی (۴) مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود لوگوں کے معاشرتی امور میں یک رنگی پیدا ہوئی (۵) تعمیرات میں ہندی اور اسلامی طرز کا ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، عمدہ قسم کی صنعتوں کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین اور مرصع کاری ان ہی کے زمانے کی یادگاریں ہیں (۶) ایک مشترکہ زبان پیدا ہوئی، جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی (۷) ملکی لٹریچر میں ترقی ہوئی (۸) مذہب میں توحید کے تصور کی تجدید ہوئی

اور تصوف پھیلا (۹) تاریخی لٹریچر پیدا ہوا (۱۰) فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبوں کو فروغ ہوا، یہ چیزیں اسلام کے پیرووں ہی نے ہندوستان کو دیں جن کے بارہ میں جدوناتھ سرکار یہ لکھ گئے ہیں کہ اسلام انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا،

وہ مغلوں کی حکومت کو قزاقی قرار دیتے ہیں (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۱ ص ۲۷) مگر ان کے قلم کی یہ تحریر بھی نکلی ہے کہ ہندوؤں کی حکومت کے زمانے میں صوبے آزاد تھے، ان میں یکسانیت نہ تھی، سیاسی اتحاد نہ تھا، قومیت کا خیال بھی نہ تھا، اس کے مقابلہ میں مغلوں کی دو سو سالہ حکومت میں یعنی اکبر سے محمد شاہ کے عہد تک شمالی ہندوستان اور دکن کے بڑے حصے میں سرکاری زبان، ملکی نظام اور سکہ جات میں بڑی یکسانیت اور یگانگت پائی گئی، جو علاقے مغلوں کے زیر نگیں نہیں رہے ان میں ہندو راجاؤں نے ان سے نظم و نسق کے طریقے اور درباری آداب سیکھے مغلوں کے زمانے میں پینتیس صوبے تھے، مگر ایک صوبہ کے آدمی کو دوسرے صوبہ میں گھر ہی کی راحت ملتی، تاجر اور سیاح ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ تک تمام سہولتوں کے ساتھ سفر کرتے، اور اس پورے وسیع ملک کو ایک پاتے، اور تمام لوگ اپنے کو ایک ہی امپائر کی برابر کی رعایا تصور کرتے (موغل ایڈمنسٹریشن باب ۱۳، ص ۲۳۸-۲۳۹) کیا یہ کارنامہ قزاقوں کے ذریعہ سے عمل میں آیا؟

ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ یہاں کے طویل قیام سے مسلمانوں کا بیرونی کیرکٹر زائل ہو گیا، ان پر خالص ہندوستانی چھاپ پڑ گئی، یہاں تک کہ سترہویں صدی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ مشکل مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ بخارا، ایران اور عرب سے جو مسلمان یہاں آئے، ان کو اپنے میں کیسے ضم کریں، ہندوستانی آب و ہوا کی وجہ سے ان کی جسمانی ساخت بدل گئی، ان کے رنگ روپ میں بھی تغیر آ گیا، انھوں نے ہندوستان کے بہت سے مراسم، اعتقادات، غذائیں، لباس اور حتی کہ ہندوستانی زبان الموسوم بہ ہندوستانی (زبان ہندوی) کو اپنا لیا، صدیاں گزرنے کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنے ایشیائی ملکوں کے بھائیوں سے بالکل دور ہو گئے، ان کے

بعد بھی جو مسلمان ہندوستان آئے، وہ دو تین نسلوں کے بعد نمایاں طور پر ہندوستانی بن گئے اور ان کی بیرونی خصوصیات جاتی رہیں (موغل ایڈمنسٹریشن ص ۴۸ - ۲۴۶، ۲ ۱۹۲۴ء ایڈیشن)

لیکن جب انھوں نے ہندوستان ریویو میں "اسلام ان انڈیا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تو اس میں رقمطراز ہیں: ہندو اور مسلمان ایک ہی سرزمین میں رہے، مگر دونوں میں آمیزش نہ ہو سکی، اس میں جو خلیج ہے اس کو کوئی چیز پاٹ نہ سکی، ہندوستان کے مسلمانوں کا رجحان ہندوستان کے بجائے باہر کی سمت رہا، آج بھی وہ نمازوں میں کھڑے ہوتے ہیں تو ان کا منھ مکہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر زمانہ میں اپنے مذہبی نشو ونما قوانین کی تدوین ملک کے انتظامی معاملات اور نوشت و خواند کے معیار کے سلسلہ میں کوئی نمونہ تلاش کرتے تو وہ ہندوستان سے باہر عرب، شام، ایران اور مصر کا ہوتا، مسلمان باشندے اس ملک میں رہنے کے باوجود اکبر کے عہد تک اس کا جز بن کر نہیں رہے، اوپر کے دونوں اقتباسات میں کس بات کو صحیح سمجھا جائے۔

انھوں نے یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اورنگ زیب ایسا بدترین حکمراں ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ کوئی اور بدتر تصور نہیں کیا جا سکتا (اسٹڈیز ان موغل انڈیا ص ۶۲ - ۴۰) مگر وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ وہ اپنی ذہانت، سیرت اور کارناموں کی وجہ سے ایشیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں سے ہے، وہ غیر معمولی درجہ کا محنتی متحرک اور با اخلاق تھا، اس کو اپنے فرائض کا احساس برابر رہا، اس کے لئے عیش و راحت ممنوع تھی، وہ نفسانی خواہشات کے سخت خلاف رہا، انسانی کمزوریوں سے وہ متاثر نہیں ہوتا، اس لئے اپنے زمانہ اور اپنے مذہبی عقائد کے بہترین روایات اور تخیلات کے مطابق اپنے لوگوں پر حکومت کی (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۱)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کی حکومت کے ابتدائی ۲۳ سال میں امن و امان رہا، خوشحالی رہی، اس کے راستے سے تمام دشمن ہٹ گئے، پوری سلطنت اس کی اطاعت گزار ہو گئی، ملک میں اس کی مضبوط اور بیدار حکومت کی وجہ سے جو امن و امان قائم ہوا تو دولت اور کلچر دونوں میں اضافہ ہوتا رہا، وہ انسانی خوشی اور شوکت کے انتہائی عروج پر پہنچ گیا، یہ اس کی زندگی کا تیسرا دور تھا (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۲)

وہ اورنگ زیب کو راون (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۴ ص ۸۳) ظالم (ایضاً ص ۱۳۶)، جھوٹا اور دغاباز (ایضاً ج ۲ ص ۴۹) سنگ دل اور ضمیر سے خالی (ایضاً ج ۱ ص ۱۰۰) ہر شرمناک واقعہ سے فائدہ اٹھانے والا (ایضاً ج ۱ ص ۱۶۵) اور اپنی جنسی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو جانے والا (ایضاً ص ۴۶) کہتے ہیں۔

مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کی دانشمندی اور خاکساری سے متاثر ہو کر درباری امراء اس کے دوست بنے رہے، جو زیر کی اس نے اپنی شہزادگی کے زمانے میں دکھائی، وہی بادشاہت کے دور میں بھی دکھاتا رہا، وہ جلباب بادشاہی میں درویشی کرتا، اپنی نجی زندگی، لباس، غذا اور تفریحات میں بہت سادہ تھا، وہ گناہوں سے پاک تھا، قرآن نے چار بیویوں کی اجازت دی ہے، مگر وہ اس سے بھی کم رکھتا، وہ اپنی بیویوں کا وفادار رہا، حکومت کے نظام کی دیکھ بھال میں اس کی محنت و مشقت حیرت انگیز حد تک تھی، وہ روزانہ دربار کرتا، عدالت کے منتظم اور دار وغہ داد خواہوں کو لاتے اور اس کے سرچشمۂ عدل سے سیراب ہوتے، بعض ایسے داد خواہوں اور مظلوموں کی التماس کو بھی سن لیتا، جن کی دادرسی امراء کی مداخلت کی وجہ سے صحیح طور پر نہیں ہوتی، حرم کے اندر جاتا تو غریب عورتوں، بیواؤں اور یتیموں کی فریاد سنتا، ان کو روپئے جاگیریں اور زیورات دے کر مطمئن کرتا، وہ چوبیس گھنٹے میں صرف تین گھنٹے سوتا، بڑی محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتا، اس کے دربار میں کام ہی کام ہوتا، کوئی تفریح نہ ہوتی (اسٹڈیز ان مغل انڈیا ص ۱۰-۴۷) ایک جگہ تو جدو ناتھ سرکار نے اس کو مافوق البشر اور آئیڈیل کیریکٹر والا بھی کہا ہے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۴ ص ۲۳۵، ج ۵ ص ۲۷۹)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی زندگی ایک طویل المیہ کی داستان ہے، وہ اپنی ناقابل تسخیر و پوشیدہ صلاحیت کے خلاف بے قاعدہ جنگ کرتا رہا، انسان کی طاقتور ترین کوششوں کو بروئے کار لاتا رہا، لیکن زمانہ کی طاقتوں سے وہ دب کر رہا، اس طرح پچاس برس کی اس کی حکومت ایک بہت بڑی ناکامی میں ختم ہو گئی (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۱) اس کی زندگی میں اس کی سلطنت کے زوال کی

نشانیاں شروع ہوگئی تھیں، اس کے آخری اٹھارہ سال میں اس کی قسمت نے اس کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا اس کے آخری زمانہ میں اس کی پوری سلطنت میں انارکی اور بدامنی رہی (ج ۵ ص ۲۵۰)

مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی تسخیر، ساگر کا براد سردار اس کا اطاعت گذار ہوا، جھگڑالو مرہٹہ راجہ پکڑ لیا گیا، اور اس کا پورا خاندان دار السلطنت میں لایا گیا، اس طرح اورنگ زیب کی فتح وکامرانی میں کسی چیز کی کسر باقی نہیں رہی (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۳) اس کی حکومت میں مغلوں کا ہلال بدر کامل ہوگیا (ایضاً ج ۱ ص ۱۱۱) غزنی سے چاٹگام، کشمیر سے کرناٹک تک اس برصغیر میں اسی کا حکم چلتا، صوبہ کا کوئی حاکم اس کی نہ عدول حکمی کرتا اور نہ خراج روکتا، یہاں وہاں کچھ بغاوتیں ہوجاتیں، لیکن کسی نے اپنے سر پر تاج رکھ کر اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی (ایضاً ج ۱ تمہید) اس نے اپنی حیرت انگیز صلاحیت، سیرت کی قوت اور فرائض کی انجام دہی کی سرگرمیوں سے ایسی طاقت پیدا کردی تھی کہ دہلی کی حکومت کا ڈھانچہ متحد رہا، اور اس کی وفات کے بیس برس تک کوئی تبدیلی نہیں آئی (فال آف دی مغل امپائر ص ۲) نادر شاہ کے حملہ تک مغلوں کا امپائر ایشیا کا متمول ترین امپائر تھا (ایضاً ج ۱ ص ۲)

انھوں نے اپنی ہسٹری آف اورنگ زیب کی پانچوں جلدوں میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ اورنگ زیب نے راجپوتوں کی دل آزاری کی، ان کو تکلیفیں پہونچائیں، ان کے مذہبی جذبات واحساسات کو مجروح کیا، اس لئے وہ اس سے دور ہوتے گئے، مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ راجپوت اورنگ زیب کے دکن کی مہم میں آخر وقت تک ساتھ دیتے رہے، ان کی ایک پوری نسل دکن میں رہی، اس نے نہ شہر دیکھا اور نہ اینٹ پتھر کے مکانات دیکھے، ان کی زندگی خیموں میں گذری، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے، وہ شکایت کرتے کہ ان کی آئندہ نسل امپائر کی خدمت کرنے کے لائق نہ ہوگی، کیونکہ ان کی زندگی دکن میں گذری ہے، وہ نہ اپنے گھروں کو گئے ہیں اور نہ اپنے بچوں کی پرورش کی ہے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۲۵۱)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب اورنگ زیب نے ہندوستان کے سارے علاقے فتح کر لئے اور تسخیر کے لئے

خاص علاقے باقی نہیں رہ گئے، تو راجپوت بے روزگار ہوگئے، کیونکہ جنگ وجدل ہی ان کا پیشہ تھا، اپنی بے روزگاری میں راجپوت گھرانوں کے حوصلہ مند افراد اپنے ہی رشتہ داروں سے اپنے گھروں میں لڑنے لگے، یا ڈکیتی پر آمادہ ہوگئے، یا پھر اورنگ زیب سے جاگیر پانے کی خاطر اپنا مذہب چھوڑنے لگے (ج ۵ ص ۵۵-۲۵۴) پھر فال آف دی مغل امپائر میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ راجپوت اتنے عیاش، راحت پسند جھگڑالو، اور لاچار دوست ہوگئے تھے کہ وہ کسی مصرف کے نہیں رہ گئے تھے،

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ آخری دور کے مغل فرمانروا بھاری لشکر رکھنے سے غافل ہوگئے تو راجپوتوں کی زندگی نامردانگی، بے روزگاری، کاہلی اور معصیت کی شکار ہوگئی، ان کے لئے کوئی باعزت اور خاطر خواہ پیشہ باقی نہیں رہ گیا، وہ اپنے بنجر وطن کے علاقوں میں محدود ہوکر رہ گئے جس کے بعد ان کی تلواریں اس میں چلنے لگیں، راجستھان میں انتشار، لوٹ مار، اقتصادی، بربادی اور اخلاقی زبوں حالی انتہا درجہ کی رہی، جدو ناتھ سرکار اپنی بے خبری میں یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ ہندو کیرکٹر کے بہترین نمائندے راجپوت تھے، لیکن میری رائے میں دہلی امپائر کے زوال کا سب سے غمناک پہلو یہ ہوا کہ یہ بہادر نسل انتہائی مذلت میں مبتلا ہوگئی، اور راجاؤں کا یہ استھان مایوس کن مصیبت میں گرفتار ہوگیا (فال آف دی مغل امپائر ج ۲ ص ۶۸)

جدو ناتھ سرکار کی تضاد بیانی ع اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، اس کی محض تھوڑی سی جھلکیاں اوپر دکھائی گئی ہیں، ان کی مورخانہ تحقیق میں ان کی تحریر کی حیثیت محض ایک ایسی چنگاری ہے کہ ع ادھر چمکی، ادھر سلگی، یہاں پھونکا وہاں پھونکا

انھوں نے اپنی ہسٹری آف اورنگ زیب کی تیسری جلد کے ضمیمہ ۵ میں "اورنگ زیب کا انہدام مندر" کے عنوان سے ان مندروں کی تفصیلات لکھی ہیں جو اس شہنشاہ کے زمانے میں منہدم کئے گئے، مگر ان کو یہ بھی دکھانا تھا کہ ان کے انہدام پر راجپوت راجا برہم نہیں ہوتے تھے، مثلاً اورنگ زیب نے اورچھا کے مندر کو منہدم

کیا، تو وہاں کے راجہ دیوی سنگھ کو وہ اشتعال پیدا نہیں ہوا، جو ڈھائی صدیوں کے بعد جدوناتھ سرکار کو ہوا، اس لئے لکھتے ہیں کہ اس مندر کے انہدام پر اورچھا کے تیئے راجہ دیوی سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں کیا اس کے دیوتاؤں کی مورتیوں کی بے حرمتی کی جائے، اس کے پجاری اور مغرور قبیلہ کے لوگ ذبح کئے جائیں، بدتمیز غیر ملکی اس کے باپ کی سرزمین کو اپنے گھوڑوں سے کچل کر رکھ دیں، اس کے گھر کی راجکماریاں موت سے زیادہ بدتر شرمناک زندگی بسر کرنے پر مجبور کی جائیں لیکن اس کو ان چیزوں کی پرواہ مطلق نہ ہو، محض اس لئے کہ اس کا علاقہ سلامت ہے، اور اورچھا کے سنگھاسن پر بیٹھ کر راجہ کہلائے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۳ ص ۲۹۱)

یہ کوئی مؤرخانہ تبصرہ نہیں ہے، بلکہ فرقہ وارانہ تعصب میں فرقہ وارانہ نفرت پھیلانا ہے۔

اب تو ڈاکٹر راجندر پرشاد (سابق صدر جمہوریہ ہند) جن چندر (بمبئی) اور پروفیسر بی۔ ان۔ پانڈے کے ذریعہ سے انکشاف ہو گیا ہے کہ اورنگ زیب بے شمار مندروں کی سرپرستی کرکے ان کو مالی امداد دیتا رہا، ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب انڈیا ڈیوائڈڈ میں لکھا ہے کہ الٰہ آباد کے مشہور مندر جھیشور ناتھ کے پجاریوں کے نام اورنگ زیب کے دو فرامین ہیں، جن سے جگ جیون گر کے گر دھر ساکن موضع بستی ضلع بنارس اجد معر ساکن جیش پور پرگنہ حویلی اور پنڈت بلبھدر رامصر کو بھی جاگیریں مندروں کے لئے دیں۔ اس نے ملتان کے مندر توت لامائی کے گوشرا جکیان داس کو تو سو روپے کا وظیفہ عطا کیا (ص ۴۰-۴۳) بمبئی کے جن چندر نے اکتوبر ۱۹۵۷ء جنوری اپریل ۱۹۵۸ء اور اپریل ۱۹۵۹ء کے جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی میں تقریباً تیس ایسے فرامین، سندوں اور پروانوں کے متن نقل کئے ہیں، جو اورنگ زیب ہندوؤں اور جینیوں وغیرہ کو ان کے مندروں کے لئے دیتا رہا، اسی طرح پروفیسر بی۔ ان۔ پانڈے نے ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء کو راجیہ سبھا میں اپنی ایک تقریر میں بتایا کہ مہا کلیشور اجین، بالاجی مندر چترکوٹ، اومانند گوہاٹی، شترونجے کے جین مندروں اور شمالی ہند کے دوسرے مندروں اور گورداروں کی مالی امداد کے لئے اورنگ زیب نے خود فرامین جاری کئے، ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ان کے پاس موجود ہیں، انہوں نے اپنی اس تقریر میں یہ بھی بتایا کہ اورنگ زیب نے بنارس کے وشوناتھ مندر کو منہدم کرنے کا اس لئے حکم دیا کہ وہاں ان کو معلوم ہوا کہ اس ایک ہندو منصبدار کچھ کے مہاراجہ کی مہارانی کی زبردستی آبرو ریزی کرکے اس پوترا استھان کو ناپاک کر دیا تھا،

اگر جدوناتھ سرکار زندہ رہتے، تو ان تمام انکشافات کے بعد وہ اپنی تحریروں کو پڑھتے، پھر اورنگ زیب کو یاد کرکے کہتے:

اس کی تو دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو
کچھ ہم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

مقالات

حضرت ابراہیمؑ اور مستشرقین

از

جناب مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم (سابق ناظم جمعیۃ العلمائے ہند)

"کلام پاک میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر جس طرح آیا ہے، اس پر بعض مستشرقین نے اپنے خیالات کا اظہار کرکے آپ کی ذات مقدس سے متعلق شک و شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس پر مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے اپنی مشہور کتاب قصص القرآن ج ۱ (ص ۱۵۶ تا ۱۷۰) میں بڑی اچھی بحث کی ہے۔ (ص ع)

مستشرقین یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں یدطولیٰ رکھتی ہے، اور بغض و عناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآن عزیز کے خلاف بے دلیل ان کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے، ایک موقع حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا بھی ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیۃ[1] نے ونسنک[2] کے حوالہ سے نقل کیا ہے .... کہ سب سے پہلے اسپرنگر[3] نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دین حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی، البتہ عرصۂ دراز کے بعد ان کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے، اور ان کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے، چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنۂ تکمیل تھا اس لئے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپرنگر کے اس دعوے کو سنوک ہرگرونیہ نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا، اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اس کو خاص آب و رنگ سے رنگین بنایا۔ اس نے کہا:

"قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں ان میں کسی ایک مقام پر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا، اور نہ ان کو اول مسلمین بتایا گیا ہے، بلکہ وہ

---

[1] جلد اص ۲۷-۲۸، [2] Wensinck [3] Sprenger

صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں، ان کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو ان کو مؤسس کعبہ اسمٰعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر و ہادی اور ملت حنیفی کا داعی ظاہر کرتی ہو، سورۂ الذاریات، الحجر، الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت جو سب کی سورتیں ہیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے سرزمین عرب میں کوئی نبی نہیں آیا، اور یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

البتہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں،

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے تھے اور انہی کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے لہٰذا اس وقت تک ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو بھی انھوں نے اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے، لیکن جب مدینہ پہنچ کر انھوں نے یہود کو اپنے مشن "اسلام" کی دعوت دی تو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور وہ آپ کے دشمن ہو گئے، اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے غور و تامل کیا اور خوب سوچا، آخر ان کی ذکاوت اور جودت طبع نے رہنمائی کی اور انھوں نے عرب کے لئے یہود کی یہودیت سے جدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیت ابراہیمی کہنا چاہئے، لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملت حنیفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسمٰعیلؑ کے والد، کعبہ کے مؤسس نظر آتے ہیں۔[1]

۱؎ Het Mah hes nsoh Feest ص ۲۰۔

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور ونسنک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب سے محض اس لئے اختراع کئے گئے ہیں کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے، اور نیز یہ کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ ان کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی، لیکن جب ایک مورخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعوے اور دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی کر کے محض عداوت اور بغض و عناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے، اس لئے کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مکی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سر تا سر غلط بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ علی بنیاد تھی ہے کہ مکی سورتوں میں سے صرف انہی کا حوالہ دیا گیا ہے، جنہیں حضرت ابراہیمؑ کو فقط ایک پیغمبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے، لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیمؑ کی شخصیت کو ہمہ حیثیت سے نمایاں کرنے کے لئے ان کے نام ہی سے معنون کر کے نازل کی گئی یعنی سورۂ ابراہیمؑ، اس کو نظرانداز کر دیا گیا، تاکہ قرآن عزیز سے براہ راست فائدہ نہ اٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے، اور کورانہ تقلید میں وہ ان کے غلط دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں۔

سورۂ ابراہیمؑ مکی ہے، اس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے، اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے۔

(۱) حضرت ابراہیمؑ عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں، اور خدا کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اس مقام کو امن عالم کا مرکز بنانے کی دعا کر رہے ہیں:۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ	اے پروردگار اس شہر (مکہ) کو تو امن کا
وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ	مرکز بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی

إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۖ
فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ
عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

(ابراہیم ع ۵)

پرستش سے دور رکھ، اے پروردگار بلاشبہ
ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا
پس جو شخص میری پیروی کرے وہ میری جماعت
میں سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے پس بلاشبہ تو

(۲) حضرت ابراہیمؑ اقرار کرتے ہیں کہ سرزمین حجاز (جو عرب کا قلب ہے) ان ہی کی اولاد سے آباد ہوئی
اور انھوں نے ہی اس کو بسایا ہے، اور وہی اس چٹیل میدان میں بیت الحرام (کعبہ) کے مؤسس ہیں۔

رَّبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ
غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ
رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم
مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ

(ابراہیم ع ۶)

اے ہمارے پروردگار، بیشک میں نے اپنی بعض
ذریت کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے
گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے، اے ہمارے
پروردگار یہ اسلئے تاکہ وہ نماز قائم کریں پس
تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس طرف پھیر دے کہ
وہ (اس کعبہ کی بدولت) ان کی جانب مائل ہوں
اور ان کو پھلوں سے رزق عطا کرتا کہ یہ شکر گذار ہیں

(۳) حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحٰق (علیہم السلام) کے والد ہیں، اور یہی اسمٰعیلؑ اہل عرب
کے باپ ہیں، اور حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ملت حنیفی کے شعار "صلوٰۃ" کی اقامت کی دعا کر رہے ہیں:

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى
الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي
لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ
الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَ

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے مجھکو بڑھاپے
میں اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ بخشے، بلاشبہ میرا
پروردگار ضرور دعا کا سننے والا ہے، اے پروردگار
مجھکو اور میری اولاد کو نماز قائم کرنیوالا بنا دے

تَقَبَّلْ دُعَاءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَ
لِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ
الْحِسَابُ ۝ (۳۹-۴۰-۴۱) (ابراہیم ع ۶)

اے ہمارے پروردگار ہماری دعا سن، اے
ہمارے پروردگار تو مجھکو اور میرے والدین کو
اور کل مومنوں کو قیام حساب (قیامت)
کے روز بخش دے۔

ان آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان لغو اور بے سروپا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقین یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے، کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں، اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے۔

(۴) اسی طرح سورۂ ابراہیمؑ کے علاوہ سورۂ انعام اور سورۂ النحل بھی مکی سورتیں ہیں، ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ شرک کے مقابلے میں ملت حنیفی کے داعی ہیں اور ان کی شخصیت اس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَ
مَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ع ۹ (الانعام)
قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ
حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ

(انعام، ۱۶۱ ع ۲۰)

بلاشبہ میں اپنے چہرہ کو اسی ذات کی طرف
جھکاتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے
والا ہے اور میں شرک کرنیوالوں میں سے ہرگز نہیں
(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دو بلاشبہ مجھ کو
میرے رب نے سیدھی راہ کی ہدایت کی ہے جو
کج مج راہ سے الگ صاف اور سیدھا دین ہے ملت
ہے ابراہیمؑ کی، جو تھا ایک خدا کی طرف جھکنے
والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (النحل ۱۵)	بیشک ابراہیمؑ تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار صرف ایک خدا کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں سے۔
ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (النحل ۱۵)	پھر وحی کی ہم نے تیری جانب (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کی، تو پیروی کر اس ابراہیمؑ کی ملت کی جو صرف خدائے واحد کی جانب جھکنے والا ہے، اور نہیں ہے مشرکوں میں سے،

تو کیا ان واضح آیات کے بعد بھی ان دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے، جو اس سلسلہ میں سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے بیان کئے ہیں؟ مکی سورتیں ہوں یا مدنی دونوں جگہ ابراہیمؑ کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ دونوں حالتوں میں ملت حنیفی کے داعی، حضرت اسمٰعیلؑ اور عرب کے باپ کعبہ کے مؤسس وبانی اور عرب کے ہادی ہیں، اور اس لئے مستشرقین یورپ کا یہ کہنا، کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن عزیز کی مکی اور مدنی آیات میں دو جدا جدا صورتوں میں نظر آتی ہے، کذب اور صریح بہتان ہے، نیز یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ عرب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت سے قبل کوئی بھی پیغمبر نہیں گذرا، اس لئے کہ ابراہیم واسمٰعیل اور ہود وصالح علیہم السلام اسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں۔

ان مدعیان علم کو تعصب نے ایسا نادان بنا دیا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس قسم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (تورات) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں، اس لئے کہ تورات میں تصریح ہے کہ اسمٰعیلؑ، ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں، اور اسمٰعیلؑ ہی عرب کے باپ ہیں، اور ابراہیمؑ کی اسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی، اور یہ دونوں باپ بیٹے عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ مکہ کی زندگی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور ان کے مذہبی امور کی تقلید کی، اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور ان کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی، اور اس کو ملت ابراہیمی کا لقب دیا" اس لئے کہ مکہ کی زندگی میں تو یہود سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو پھر مخالفت وموافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا، البتہ مدینہ میں آکر آپؐ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی اور یہ اس لئے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کے مطابق دین موسوی کے پیرو تھے، اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی، مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے، اور ان کی محرف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے جملے ایسے موجود تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں اور ان سے آپؐ کے حق میں بشارات نکلتی ہیں، نیز بہت سے وہ احکام بھی موجود تھے جو صحیح معنی میں وحیِ الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں، اور دین موسوی کی اساس وبنیاد رہے ہیں، اس لئے آپ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملت ابراہیمی یعنی اسلام قبول کر لیں گے، لیکن جب آپؐ نے ان کے انکار، بغض وحسد کا تجربہ کر لیا تو پھر ان کے ساتھ بھی آپ کا معاملہ وہی ہو گیا، جو مشرکین کے ساتھ تھا، اور بمصداق "الکفر ملۃ واحدۃ" (کفر سب ایک ملت ہے) آپؐ نے ان سب کو ایک ہی حیثیت میں رکھا۔

اسپرنگر، سنوک اور ان کے ہمنوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں، یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کے دادا تھے اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرت اسرائیل علیہ السلام کی جانب کرتے اور بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے تو ان کا یہ کہنا کہ ابراہیمؑ بھی یہودی تھے، کس قدر مضحکہ خیز تھا، کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ عرصۂ دراز کے گذرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا۔

پس اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے قرآن عزیز نے یہ اعلان کیا:-

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا	ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی، البتہ

نَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا۔ — وہ تھے ایک خدا کی جانب جھکنے والے مسلمان.

مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تو یہود کے دین پر تھے لیکن مدینہ جا کر جب یہود نے ان کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوت طبع سے یہودیت ابراہیمی ایجاد کر لی، سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ

سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے اس دعوے کی دلیل میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گذرا، قرآن عزیز کی اس آیت کو بھی پیش کیا ہے:۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰھُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِکَ۔ — تاکہ تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ڈرائے ایسی قوم کو کہ نہیں آیا ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا.

وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآن عزیز امت عربیہ کے متعلق اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہ کرتا.

مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآن عزیز کے طرز خطابت، اسلوب بیان، اور باطل پرستوں کی باطل پرستی کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوا ہے، یا گذشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض وعناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے

اصل حقیقت یہ ہے کہ عرب کا بہت بڑا حصہ بت پرستی میں مبتلا تھا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے عقائد اور دین کے نام سے کچھ احکام مرتب کر رکھے تھے، مثلاً دیوتاؤں کی نذر اور قربانی کے لئے سائبہ، بحیرہ اور وصیلہ کی ایجاد، اور مختلف بتوں کی پرستش کے مختلف قواعد و ضوابط وغیرہ، اس لئے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی اور شرک اور بت پرستی سے روکا تو وہ کہنے لگے کہ تمھارا یہ کہنا کہ ہم بد دین ہیں اور ہمارا کوئی الہامی دین نہیں ہے، غلط ہے، ہم تو خود مستقل دین رکھتے ہیں، اور وہ ہمارے

باپ دادا کا قدیمی دین ہے۔

قَالُوْا قَدْ وَجَدْنَا عَلَیْھَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِھَا۔ — مشرکین نے کہا ہم نے اسی (بت پرستی) پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔

تب قرآن عزیز نے ان کے باطل عقائد کی حقیقت کو ان پر واضح کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو بتایا جائے کہ کسی دین کے خدائی دین ہونے کے لئے دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں، یا حسی اور عقلی راہ سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ خدا کا دین اور اس کا مرغوب مذہب ہے، اور یا نقلی روایات اس کا قطعی یقینی اور ناقابل انکار ثبوت پیش کرتی ہوں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت ہے، اور اگر یہ دونوں راہیں کسی دعوے کے لئے بند ہیں تو وہ دعویٰ باطل اور اس کا مدعی کاذب ہے۔

لہذا قرآن عزیز نے مشرکین کے اس دعوے کی تردید کے لئے آیات قرآنی کے تین حصے کر دیئے، ایک حصہ میں اس کے اس دعوے کا انکار اور دعوے کی غیر معقولیت کا اظہار کیا اور بتایا کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ اَللّٰہُ اَمَرَنَا بِھَا (ہم کو خدا نے ایسا (شرک) کرنے ہی کا حکم دیا ہے) بالکل غلط اور سراپا باطل ہے اس لئے کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ط اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (الاعراف) — بلاشبہ اللہ تعالیٰ بیہودہ خرافات کا حکم نہیں دیا کرتا (اے مشرکین) کیا تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے.

اور دوسرا حصہ ان کے باطل دعوے پرستی اور عقلی سند کے مطالبہ سے متعلق کیا اور بتایا کہ وہ عقل سے یہ فتویٰ صادر کریں کہ جو کچھ خدا کے ساتھ انھوں نے غلط نسبتیں قائم کر رکھی ہیں اور جن پر ان کے مزعومہ دین کی بنیاد قائم ہے، وہ کس طرح سمجھ اور اہل عقل کے نزدیک قابل تسلیم ہیں؟ وہ کہتا ہے:

فَاسْتَفْتِھِمْ اَلِرَبِّکَ الْبَنَاتُ وَلَھُمُ — پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان سے دریافت

الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا
وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ
مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ وَلَدَ اللّٰهُ
وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ اَصْطَفَى
الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ
كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

(الصافات ع ۵)

کر دیں تمہارے پروردگار کے لیے لڑکیاں
ہیں اور ان کے لیے لڑکے، کیا ہم نے فرشتوں
کو لڑکیاں بنایا، اور وہ اس وقت موجود
تھے، خبردار! بلا شبہ یہ سب ان کی بہتان طرازی
ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے، بلا شبہ
یہ قطعاً جھوٹے ہیں (یہ کہتے ہیں کہ خدا نے)
اپنے لیے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند کیا

اور تیسرا حصہ ان کے باطل عقیدوں کے متعلق نقلی سند کے مطالبہ سے وابستہ گیا، قرآن عزیز ان سے سوال کرتا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور اس کو خدا کا دین بتا رہے ہو تو کیا تمہارے پاس اس کے لیے خدا کی جانب سے کوئی حجت اور دلیل نازل ہوئی ہے یا اس کے پاس سے ان عقائد کی صداقت کے لیے کوئی کتاب بھیجی گئی ہے، اگر ایسا ہے تو پیش کرو؟

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَاْتُوْا
بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(الصافات ع ۵)

کیا تمہارے پاس کوئی ظاہر حجت اور صاف
دلیل ہے، پس تم اپنی (خدا کی جانب سے نازل شدہ)
وہ کتاب لاؤ، اگر تم سچے ہو۔

اب اگر ان کے اپنے دعوے کی صداقت کے لیے ان کے پاس نہ کوئی حسی و عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی سند کے طور پر کوئی حجت و کتاب تو پھر ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سے خدا کا دین موجود ہے اور اس کی منضبط شریعت بھی! بالکل غلط اور باطل دعویٰ ہے۔

اسی طرح مشرکین پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تمہارے پاس اپنے دعوائے باطل کے سلسلہ میں نہ عقلی سند ہے نہ نقلی، اور ان کو لاجواب بنانے کے لیے سورۂ احقاف میں بھی یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ
الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي
السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ
مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ

(احقاف ع ۱)

تم مجھے بتاؤ کہ اللہ کے سوا جن کو تم پوجتے ہو
مجھے دکھلاؤ کہ انھوں نے زمین سے کیا بنایا!
کیا ان کی آسمانوں میں (اللہ کے ساتھ) کوئی
شرکت ہے، اس سے پہلے کوئی کتاب اگر تمہارے
پاس ہے (جو اس دعوے کی تصدیق کرتی ہو)
تو وہ لے آؤ یا علم اولین میں سے کوئی بقیہ علم ہے؟

یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک دوسرے پیرایہ میں قرآن عزیز کی ان آیات میں بیان کیا گیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا، ان آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمین عرب (حجاز) ہمیشہ سے خدا کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے، اور اس ملک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سب سے پہلی آواز ہے، قرآن عزیز ایسی خلاف حقیقت بات کس طرح کہہ سکتا تھا جب کہ سورۂ ابراہیم، الانعام اور النحل کی آیات میں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے عربی نبی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جو ابھی نقل کی جا چکی ہیں، بلا شبہ قرآن عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے، کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اسی بات کا اقرار، اس لیے کہ وہ خدائے عالم الغیب والشہادۃ کا کلام ہے نہ کہ بھول چوک کرنے والے انسان کا کلام

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ
كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا
فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۔

کیا انھوں نے قرآن پر غور نہیں کیا اور اگر وہ
ہوتا اللہ کے سوا کسی اور کا کلام تو ضرور پاتے
اس میں بہت سا اختلاف۔

لہٰذا قرآن عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور وینسنک کے یہ تمام دعاوی اور ان کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور افترا ہیں، اور ان کے طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور

اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآن عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ ان کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اگلتے، غلط الزام قائم کرتے اور صریح اور واضح مسائل میں اپنے پیش نظر مقاصد کے مطابق گنجلک پیدا کر کے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں، بلکہ اس قسم کے الزامات سے ان کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے جس کو قرآن عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لئے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کر دیا ہے۔

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً — یہ (منکرین قرآن واسلام) یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش تم بھی ان کی طرح منکر [illegible]

اس لئے ان منکرین (کافروں) کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا۔ — اے پروردگار ہمارے دلوں کو ہدایت یافتہ اور راہ یاب کر دینے کے بعد کجی کی جانب مت مائل کرنا

بہرحال قرآن حکیم کی مسطورۂ بالا زیر بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اس کے درمیان اور الانعام، النحل اور ابراہیم جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے پیغمبر عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔

اس پیش کردہ تفصیل و تشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں موجود تھے، ان کے گذشتہ آباء و اجداد اور گذشتہ تاریخ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مقالات شبلی جلد ششم (معترضین اسلام کے جوابات) قیمت ۱۱ روپیہ

اردو زبان و ادب
میں
قرآنی الفاظ کا استعمال

از
جناب ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ اسلام آباد پاکستان

یہ مقالہ ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے سیمینار منعقدہ ۳ جون ۸۳ء میں پڑھا گیا۔

اس عنوان میں دو لفظ مرکزی اور بنیادی اہمیت کے حامل ہیں، ایک اردو، دوسرا قرآن میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو میری مادری زبان ہے، لیکن اگر مادری زبان سے مراد وہ زبان لی جائے جو انسان آغوش مادر میں یا گہوارۂ طفلی میں سیکھتا اور بولتا ہے، تو اس لحاظ سے یہ میری مادری زبان ضرور ہے، اس کے علاوہ لکھنے پڑھنے کی میری زبان شروع سے اردو ہی رہی ہے، علم الکتابی اور مطالعہ کی حد تک بھی اردو کے ساتھ میرا تعلق تسلیم کیا جا سکتا ہے، پھر بھی خود کو اس باب میں اس بات کا حقدار نہیں سمجھتا کہ یہ کہہ سکوں کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ اس لئے میں نے اردو لغات سے تصدیق کرنے کے بعد ہی کوئی بات کہی ہے۔ رہا قرآن تو عربی اور دینی تعلیم کے طفیل، نیز مسلمان ہونے کے ناطے تلاوت اور مطالعۂ قرآن کے تعدد کی وجہ سے اتنی شد بد ضرور ہو گئی ہے کہ لغات القرآن، مفتاح یا کلید کی طرف رجوع کئے بغیر کسی لفظ کے بارے میں بلا تامل یہ فیصلہ کر سکوں کہ یہ لفظ قرآن میں آیا ہے یا نہیں۔ ہاں حوالوں کے لئے کہیں کہیں مجھے ان کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

جیسا کہ عنوان کے الفاظ سے ظاہر ہے، یہ موضوع بیک وقت لسانی، ادبی، دینی، تہذیبی اور ثقافتی ہے، اور جس کو آج کل کی ایک جامع اصطلاح عمرانیات سے احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ موضوع کے یہ مختلف پہلو آپس میں اس طرح خلط ملط ہیں کہ ان کے مابین حد فاصل قائم کرنا ممکن نہیں، اور یہ سب ایک دوسرے پر

اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے اثر پذیر بھی، میرا یہ پختہ یقین ہے اور اس کے شواہد ہمیں تاریخی لسانیات، توضیحی لسانیات، اور تقابلی لسانیات کے تحت مختلف زبانوں کے مطالعے سے بافراط اور بخوبی مل سکتے ہیں کہ دین، دینی کتب اور دینی ادب کسی زبان کا ہیولیٰ تیار کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ کوئی نظریہ یا مفروضہ نہیں بلکہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس کی تصدیق کسی بھی زبان کے تاریخی مطالعے سے کی جا سکتی ہے۔ ہم اس سے ایک درجہ نیچے اتر کر بھی کم سے کم اس قدر تو ضرور ہی کہہ سکتے ہیں کہ کسی زبان پر اس زبان کے بولنے والوں کے دینی افکار و تصورات اور متعلقہ الفاظ کی گہری چھاپ ہوتی ہے، میری اس گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ میں زبان کی تشکیل میں دوسرے عوامل و محرکات کی کارفرمائی کا منکر ہوں، زبان چونکہ زندگی کی عکاس ہوتی ہے اور اس کا ادب زندگی کا ترجمان، اس لئے دین و مذہب اور اخلاقی اقدار کے علاوہ بھی انسانی زندگی کے مختلف النوع مظاہر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے اثرات بھی تناسب سے ہمیں زبان و ادب میں نظر آتے ہیں جس تناسب سے انسانی زندگی میں ان کا عمل دخل ہوتا ہے، خود مختلف ادیان و مذاہب کے باہمی اختلافات کا پرتو بھی ہمیں زبان و ادب میں نمایاں نظر آ سکتا ہے، علیٰ ہذا القیاس ایک ہی زبان کے دائرے میں ایک فرد کے دوسرے فرد کے ساتھ یا ایک گروہ کے دوسرے گروہ کے ساتھ اختلاف کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ایک زبان کے بولنے والے ایک ہی دین کے مختلف مذہبی فرقوں کی لفظیات کا امتیازی فرق بھی اپنی طرف توجہ کو مبذول کئے بغیر نہیں رہتا، ایک رندِ شاہد باز و حق کی گفتگو بھی بادہ و ساغر کے بغیر نہیں کرتا جب کہ ایک سنجیدہ مسلمان، "نقل کفر کفر نباشد" کی رخصت کے باوجود کوئی گندی بات بھی کہتا ہے تو استعارے کی زبان استعمال کر کے اشارے کنائے میں کہتا ہے، کہ ادب کا یہ پہلا قرینہ اور ادبی زبان کا ایک بنیادی تقاضا ہے، میرا دائرہ کار چونکہ بحیثیت مجموعی پوری اردو زبان ہے اس لئے اس قسم کے جزئی اختلافات کو زیر بحث لا کر اعتراض کرنا درست نہ ہو گا۔

موضوع کی مناسبت سے اگرچہ میرا دائرہ کار اردو میں قرآنی الفاظ کے استعمال کا فقط جائزہ لینا ہے

مگر اس کے لئے صرف اتنا کافی نہیں کہ اردو اور قرآن کے ایسے مشترک الفاظ کی ایک فہرست پیش کر دی جائے جو قرآن میں بھی آئے ہیں، اور اردو تحریر و تقریر میں بھی استعمال ہوتے ہیں، ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اسباب و علل کیا ہیں، اور تاریخی اعتبار سے تاثیر و تاثر کے اس عمل کی نوعیت کیا ہے، ظاہر ہے کہ اردو یا دنیا کی کسی زبان میں قرآن کے کچھ خاص یا عام الفاظ پائے جاتے ہیں تو یہ محض امر اتفاق نہیں ہے ورنہ ہم اسے توارد کہہ کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

قرآن کی انقلاب آفرینی کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے، مدت ہوئی کہ یہ انقلاب گذر چکا ہے اور اس وقت ہمیں اس کے باقیات میں سے صرف برصغیر پاک و ہند کی ایک زبان اردو پر اس کے چھوڑے ہوئے اثرات کا ایک جائزہ پیش کرنا ہے، جس طرح سیلاب آتا ہے تو جہاں اپنے ساتھ خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے وہاں اپنی گذرگاہ کو زرخیزی اور شادابی کی دولت سے مالا مال بھی کر جاتا ہے، قرآن کی انقلابی تحریک کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے معانی اور مطالب ہی کے نہیں الفاظ اور اسالیب کے جواہر پارے بھی دنیا کو عطا کئے، کسی زبان میں الفاظ کی درآمد و برآمد کا عمل موقوف ہوتا ہے اس کے بولنے والوں کی [illegible] اضطراری جمود و ماندگی کے ارتقاء اور تغیر و تبدل پر اس قاعدۂ کلیہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں ماضی سے مثالیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، ہم اپنے حال سے اس کے شواہد حاصل کر سکتے ہیں، روئے زمین کے جس جس حصے پر قرآن کی انقلابی تحریک کی علمداری قائم ہوئی وہاں وہاں اس کی زبان کے اثرات کا پہنچنا لازمی تھا، عربی کو لغت القرآن کہتے ہیں کہ وہ اسی زبان میں نازل ہوا، لیکن قرآن نے عربی کو من و عن قبول کرنے کی بجائے اپنے تحریکی تقاضوں کے مطابق اس کے طریق اظہار اور اسلوب بیان میں ہی نہیں، ذخیرۂ الفاظ میں بھی بہت سے تصرفات کئے، یہ فرق نزولِ قرآن سے پہلے کی عربی اور نزول قرآن کے بعد کی عربی کے تقابلی مطالعہ سے بالکل نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے، اس کی وجہ وہ افکار و عقائد اور زندگی کی وہ قدریں ہیں جنھیں قرآن نے روشناس کرایا اور جو اس کی انقلابی تحریک کے اجزائے ترکیبی اور لازمی حصہ تھے۔ اردو جو اس وقت ہماری بحث کا موضوع ہے اسے عربی کی طرح لغت القرآن

ہونے کا شرف حاصل نہیں، لیکن اگر میں یہ کہوں کہ عربی کے بعد قرآنی تحریک کی سب سے بڑی علمبردار یہ زبان رہی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے وسیع دینی لٹریچر اور لسانی سرمایے میں قرآنی الفاظ کے تناسب کو دیکھتے ہوئے میرے اس دعوی میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے، اردو میں قرآنی الفاظ کے تناسب کا عالم یہ ہے کہ آپ ہزار صفحات کی اس کتاب میں سے کہیں سے ایک ٹکڑا لے لیجیے اور اندازہ لگائیے کہ کتنے فیصد الفاظ بعینہ اردو میں موجود ہیں، اور کتنے فیصد قدرے تغیر کے ساتھ موجود ہیں اور کتنے فیصد وہ الفاظ نکلتے ہیں جو اردو میں موجود نہیں ہیں، ایک اندازے کے مطابق اردو میں عربی الفاظ کا تناسب ۲۳ فیصدی ہے جب کہ قرآنی الفاظ کا تناسب ۵۰ فیصدی ہے یعنی قرآن میں کل جتنے الفاظ آئے ہیں ان میں سے ۵۰ فیصدی الفاظ بعینہ یا ادنیٰ تغیر کے ساتھ اردو میں مستعمل ہیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، سورۂ فاتحہ کو سامنے رکھ لیجیے اور خود پرکھ کر دیکھ لیجیے، الحمد للہ مرکب صورت میں بھی ہم بولتے اور لکھتے ہیں اور حمد اور اللہ الگ الگ بھی، رب، عالم، رحمٰن، رحیم، مالک، یوم دین، بعینہ اردو کے الفاظ ہیں، نعبد کی اصل عبد اور عبادت، اسی طرح نستعین کے مصدر، استعانت اور اسی اصل کے دوسرے الفاظ اعانت، معین، تعاون اور معاونت وغیرہ اردو کے عام الفاظ ہیں، اہدنا کے مادے سے ہدیٰ، ہدایت، ہادی، مہدی سے اہل اردو نا آشنا نہیں، صراط مستقیم سے کون ناواقف ہے، نعمت کی اصل سے انعام منعم نعمت وغیرہ اردو کے معروف الفاظ ہیں، غیر، مغضوب اور ضال بھی ہمارے لئے اجنبی نہیں، یہ تو وہ الفاظ ہیں جو اردو کے ذخیرہ الفاظ کا حصہ ہیں، اب ان کے مقابل اس سورہ کے باقی ماندہ الفاظ دیکھیے جو ایک اردو داں محض اپنی اردو دانی کی وجہ سے نہیں جان سکتا، ایاک، ضمیر منصوب، الذین اسم موصول، علیہم مرکب جار مجرور اور لا ئے نافیہ وہ الفاظ ہیں جنھیں ہم اردو کے الفاظ میں محسوب نہیں کرسکتے، اس سورہ کے ۲۵ الفاظ ہیں سے ۲۰ ایسے ہیں جنھیں کلّاً یا جزءاً ایک اردو داں شخص جانتا ہے، صرف پانچ الفاظ ایسے ہیں جنھیں ہم اس فہرست سے خارج کرسکتے ہیں، لیکن مرکب فقروں کی صورت میں ان سے بھی کہیں نہ کہیں اردو میں ملاقات ہو ہی جاتی ہے، جیسے علیٰ حرف جر بھی پر، علی الترتیب علیٰ ہذا القیاس وغیرہ

میں ہم بولتے ہیں، تا نفی تعلّمنا میں موجود ہے، لاً لاحاصل، اور لاریب وغیرہ میں موجود ہے، اس سورہ میں اردو کے مانوس الفاظ کا تناسب ۸۰ فیصدی بنتا ہے، قرآن کے بعض مقامات ایسے بھی ہوں گے جہاں یہ تناسب بہت ہی کم ہوگا، اس لئے جن اہل الرائے نے بحیثیت مجموعی ۵۰ فیصدی کا تناسب نکالا ہے، ان کی رائے کو درست تسلیم کرلینا چاہئے، ہمیں ایسی اردو کے نمونے بھی مل سکتے ہیں، جن میں قرآن کا ایک لفظ قسم کھانے کو بھی نہیں نکالا جاسکتا، لیکن ایسی مثالیں شاذ کے حکم میں آتی ہیں، اور آپ کو معلوم ہے کہ الشاذ کالمعدوم، میری گفتگو اردو بولنے یا لکھنے والے کسی خاص فرد یا گروہ کو سامنے رکھ کر نہیں ہے، بلکہ بحیثیت مجموعی پوری اردو زبان ہے۔

قرآن کے جو الفاظ اردو میں مستعمل ہیں، ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ کسی مقالے یا مضمون میں ان کا احاطہ ممکن نہیں، اور یہ بات حوالوں اور مثالوں کے ساتھ کی جائے تو نمونے کے چند الفاظ پر ہی اکتفا کرنا ہوگا ان الفاظ کی مختلف جہات سے تقسیم اور درجہ بندی بھی کی جاسکتی ہے مگر اس کے لئے ہمیں تنگنائے مقالہ کی بجائے کتاب کی وسعت درکار ہوگی۔ تقریر اور تحریر کی زبان میں بالجملہ جو فرق ہوتا ہے اس کا اثر قرآن کے ان الفاظ میں بھی نظر آئے گا۔ کچھ الفاظ صرف بول چال میں استعمال ہوتے ہیں تو کچھ صرف لکھنے پڑھنے کی زبان میں نظر آتے ہیں، کچھ تحریر و تقریر دونوں میں یکساں جگہ پاتے ہیں، کچھ صرف دینی بحثوں میں آتے ہیں تو کچھ صرف علمی ادبی بحثوں میں بار پاتے ہیں، صوری اعتبار سے ان الفاظ میں کسی تغیر کی نشاندہی مشکل ہے البتہ معنوی اعتبار سے انھیں چند خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے، ایک قسم ان الفاظ کی ہے جو بالکل انھی معنوں میں اردو میں بھی مستعمل ہیں جن معنوں میں انھیں قرآن نے استعمال کیا ہے، دوسری قسم میں وہ الفاظ آتے ہیں جو اردو میں قرآن کے معنی سے ہٹ کر مختلف معنی میں استعمال ہوتے ہیں، کچھ الفاظ ایسے ہیں کہ قرآن میں ان کے معنی میں وسعت اور تنوع ہے، جب کہ اردو میں نہیں ہے، اسی طرح اس کے برعکس صورت بھی ہو سکتی ہے، لیکن یہ تحقیق طویل ہے اور اس میں پڑنا باعثِ طوالت ہے، اس لئے اس سے صرفِ نظر ہی اولیٰ ہے۔

اردو میں مستعمل قرآنی الفاظ کی فہرست یا ان کے اعداد و شمار پیش کرنے کا یہ محل نہیں، مدعا کی وضاحت کے لئے میں نمونۃً حروف تہجی کی ترتیب سے کچھ ایسے الفاظ درج کرتا ہوں جو قرآن کے الفاظ ہیں اور اہل اردو انہیں لکھتے اور بولتے ہیں:

اثر ۔ آثار | واحد جمع دونوں صورتوں میں یہ لفظ قرآن مجید میں ایک نہیں متعدد جگہ وارد ہوا ہے، اور اردو میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے، ملاحظہ ہو سورہ طٰہٰ کی آیت ۹۶، سورہ فتح کی آیت ۲۹، سورہ روم کی آیت ۵۰، سورہ مؤمن کی آیات ۲۱ اور ۸۲، قرآن مجید میں اس کا معنی محدود اور محل استعمال خاص ہے جب کہ اردو میں اس کے معانی میں بڑا تنوع اور وسعت ہے، اور محل استعمال میں گوناگونی ہے۔

اثم ۔ آثم | اثم اور آثم بمعنی گناہ اور گنہ گار قرآن ہی کی دین ہے، لیکن اس کا استعمال اردو میں بہت محدود ہے، دستخط کے ساتھ "راقم آثم" بعض لوگ لکھتے ہیں، سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۳ میں ہے، فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (سو اس کا دل گناہ سے آلودہ ہے) یہ لفظ اس کے علاوہ بھی کئی جگہ آیا ہے۔

آخر ۔ آخرت | آخر اور آخرت کے الفاظ اردو میں کثرت سے مستعمل ہیں، یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں اس کثرت سے آئے ہیں کہ اگر ان کا احاطہ کیا جائے تو ایک رسالہ تیار ہو جائے، صرف سورتوں کے نام اور آیتوں کے نمبر درج کرنے کے لئے بھی کئی صفحے درکار ہوں گے۔

آدم | آدم جس کے دم سے ہم آدمی ہیں اور دنیا میں آدمیت قائم ہے، قرآن کا خاص لفظ ہے اور ہماری اردو اس کے لئے قرآن ہی کی رہین منت ہے، قرآن اور اردو دونوں میں اس لفظ نے لفظی ہی نہیں معنوی اور فکری اعتبار سے بھی انقلابی کردار ادا کیا ہے، اور دونوں میں اتنی کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ حوالہ اور مثال کی ضرورت نہیں۔

افق ۔ آفاق | افق اور اس کی جمع آفاق دونوں قرآن میں آئے ہیں، اور دونوں اردو کی زینت ہیں۔ غالبؔ کا شعر ہے

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت　　اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

سودا کہتے ہیں:

ٹکڑے ہوئے جگر کے آسودہ بھلے کو　　خونناب دل سے ورنہ آفاق بہ گیا تھا

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ سورہ حٰم السجدہ کی مشہور آیت ہے۔

ابد | ابد جس کی ضد ازل ہے، اردو کا لفظ ہے اور قرآن سے ماخوذ ہے اور بیسیوں جگہ آیا ہے۔

ابلیس | ابلیس اور اسی طرح شیطان کا لفظ اور مفہوم بھی ہمیں قرآن ہی نے سمجھایا ہے۔

اتباع | اتباع بمعنی پیروی کرنا بھی قرآن کا لفظ ہے، سورہ بقرہ (۱۷۸) اور سورہ نساء (۱۵۷) میں بالکل اسی طرح مصدری حالت میں آیا ہے، باقی اس کے مادہ کے مشتقات اور صیغوں کا شمار نہیں۔

اجر | اجر بمعنی بدلہ، قرآن اور اردو میں اس قدر عام ہے کہ کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔

اجل | اجل بھی قرآن اور اردو کا معروف مشترک لفظ ہے۔

اللہ ۔ الٰہ | اللہ اور الٰہ تو خالصۃً قرآن کی دین ہے

باطل، باطن، باقی، باقیات اور بقیہ، بر، بحر، برات، برج کی جمع بروج، برق، برکات وغیرہ، ان سب کی شہادتیں قرآن میں موجود ہیں اور یہ سب اردو کے الفاظ ہیں۔

تابوت | تابوت اردو زبان اور مسلم معاشرت کا ایک عام معروف لفظ ہے، اردو میں جنازے یا اس صندوق کے لئے بولا جاتا ہے جس میں میت رکھی جاتی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لفظ اردو نے قرآن سے نہیں لیا ہے قرآن مجید میں یہ لفظ دو جگہ تقریباً انہی معنوں میں آیا ہے، ایک جگہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۸ میں طالوت کے قصے میں إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ الی آخرہ اس کی حکومت کی نشانی یہ ہے کہ تمھارے پاس ایک تابوت آئے گا، اس میں تمھارے پروردگار کی طرف سے طمانیت کا سامان ہوگا۔ اس کے بعد سورہ طٰہٰ کی آیت ۳۹ میں حضرت موسیٰؑ کے دریا میں ڈالے جانے کے واقعہ میں آتا ہے:

أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ الآیۃ کہ ان کو (موسیٰ کو) ایک صندوق میں رکھو اور دریا میں ڈال دو۔

اردو میں اس کا استعمال اتنا عام ہے کہ مثال کی ضرورت نہیں، تجہیز و تکفین کی رسوم میں اس کا ورود ناگزیر ہوتا ہے، تابوت اٹھنا، جنازہ اٹھنا، دونوں کے معنی ایک ہیں۔ ہندوؤں میں اس کے لیے ارتھی اور ارتھی اٹھنا بولتے ہیں، اس موقع پر ہندو کبھی تابوت کا لفظ نہیں استعمال کرے گا جب کہ مسلمان کبھی ارتھی کا لفظ استعمال نہیں کرے گا،

تاخیر | تاخیر اردو کا ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے، جو عربی قواعد کی رو سے باب تفعیل کا مصدر ہے، یہ لفظ بحالت مصدر یہیں کہیں نہیں آیا ہے، مگر فعل کی صورت میں ایک نہیں متعدد جگہ استعمال ہوا ہے۔

تارک | تارک بمعنی چھوڑنے والا۔ اردو میں تارک الدنیا اور تارک الصلاۃ بولتے ہیں۔ سورۂ ہود کی آیت ۱۲ میں ہے فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ۔

تاسیس | تاسیس بمعنی اساس رکھنا، بنیاد ڈالنا۔ قرآن میں بحالت مصدر تو نہیں ہے، لیکن بصورت فعل متعدد جگہ آیا ہے۔

تالیف | تالیف بصورت فعل ماضی و مضارع قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اور اکثر قلب کے ساتھ آیا ہے، جیسے فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ۔ اردو میں تالیف قلب کی ترکیب استعمال ہوتی ہے جو ظاہر ہے قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ غالب نے اس لفظ کو ایک جگہ یوں استعمال کیا ہے

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

تالیف و تصنیف کے علاوہ مؤلف اور مؤلفہ قلوں میں بھی یہ لفظ جلوہ گر نظر آتا ہے۔

ت سے شروع ہونے والے بے شمار ایسے الفاظ ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں جیسے تاویل، تائید، تبدیل، تبسم، تبلیغ، تجسس، تجہیز، تحت، تحریر، تحریف، تحریف، تحریم، تحصیل، تحویل، تحریر، تخفیف، تخیل، تدبر، تدبیر، تذکرہ، تراضی، ترتیل، ترویج، تزئین، تسبیح، تسلیم، تسمیہ، تسنیم، تسویہ، تشبیہ، تصدیق، تصویر، تضمین، تطہیر، تعارف، تعاون، تعذیب، تعلیم، تعلم، تغیر، تغییر، تفرقہ، تفریق، تفصیل، تفضیل

تقدم، تقدیر، تقرب، تقریب

یہ اور اس قسم کے بے شمار الفاظ باب تفعیل اور تفعل کے مصدر یا فعل کی صورت میں بکثرت قرآن میں آئے ہیں اور یہ سب اردو میں رائج ہیں۔

شراب طہور | جنت کے مشروب کے لئے شراب طہور کی اصطلاح بلا شرکت غیرے قرآن کی اختراع ہے، اس کا ذکر سورۂ دہر کی آیت ۲۱ میں آتا ہے: وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا، ایک جگہ مَاءً طَهُورًا بھی آیا ہے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ادبی ذوق رکھنے والے اسے اپنی گفتگوؤں میں استعمال کرتے ہیں، غالب نے اسے اور انداز سے برتا ہے جس میں شوخی بھی ہے اور واعظ سے چھیڑ بھی۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

اردو میں لفظ شراب نشہ آور مشروب کے لئے بولا جاتا ہے جو شرعاً حرام ہے، لیکن قرآن میں یہ محض پینے کی چیز کے لئے آیا ہے، اردو کی شراب کے لئے قرآن میں خمر کا لفظ آتا ہے۔

سراب | سراب اردو کا ایک عام لفظ ہے، صحرا میں پانی کا دھوکا یا مطلقاً دھوکا کو کہتے ہیں، قرآن میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے، سورہ نور کی آیت ۳۹ میں ہے:۔ أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ ٱلظَّمْـَٔانُ مَآءً ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے صحرا میں سراب جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔ سورۂ نبا کی آیت ۲۰ میں ہے وَسُيِّرَتِ ٱلْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا پہاڑ چلا دیے جائیں گے پس ریزہ ریزہ ہو کر ریت بن جائیں گے۔ اردو میں میر کا شعر ہے:

دھوکا ہے سارے خشک و تر روزگار میں دریا اگر حباب ہے صحرا سراب ہے

غالب کہتے ہیں:۔

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا

کفر۔ ایمان | غالب کا ایک مشہور شعر ہے، جس میں کفر ایمان اور کعبہ قرآن کے یہ تینوں لفظ یک وقت نظم ہوئے ہیں

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

مائدہ | مائدہ بمعنی دستر خوان، قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ قرآن کی ایک سورہ کا نام ہی مائدہ ہے۔ اردو بول چال یا عام تحریروں میں استعمال نہیں ہوتا۔ البتہ غالب نے اسے ایک آدھ جگہ استعمال کیا ہے:

دلِ حسرت زدہ تھا، مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دندان نکلا

لیکن یہ ایسی اردو ہے جو غالب ہی کے یہاں ملتی ہے، اور جسے بمشکل ہی اردو کہہ سکتے ہیں۔

تقویٰ | تقویٰ قرآن کی خاص اصطلاح ہے، غالب کے ایک شعر میں اس کا استعمال ملاحظہ ہو:۔

دل گزرگاہِ خیالِ مئے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

اب سلسلۂ گفتگو ختم کرنا چاہئے، مقصد استقصا یا احاطہ نہیں، بلکہ چند مثالوں سے یہ واضح کرنا ہے کہ اردو میں قرآن کے الفاظ کس طرح در آئے ہیں، یہ اثر کتنا وسیع اور یہ سلسلہ کتنا طویل ہے۔

(مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شاہکار کتاب)

ارض القرآن حصۂ اوّل

قرآن مجید کی تاریخی آیات کی تفسیر سرزمین قرآن، عرب کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام یعنی ثمود و عاد و قوم لوط و قوم نوح و قبائل و شعوب کی سرگذشت اور ان کے ہر قسم کے حالات کا ذکر ہے، ان کی تاریخی اور اثری تحقیق

قیمت :- ۱۵ روپے

ارض القرآن حصۂ دوم

اس میں بنو ابراہیم کی تاریخ اور عربوں کی قبل از اسلام تجارت، زبان اور مذہب پر حسب بیان قرآن مجید و تطبیق آثار و تاریخ یونان و روم و کتب آسمانی توریت و انجیل تحقیقات و مباحث ہیں۔

قیمت :- ۱۱ روپے

کتاب سازی، وراقت

از

جناب ملا محمد عبد الحلیم چشتی صاحب، کانو، نائجیریا

اسلامی قلمرو میں ہر نوع کے کتب خانوں کی کثرت حکم اقرار کے نور کا فیضان و عوامل و محرکات کتب خانے اور عباسی خلفاء کی عالمگیر تحریک کتب خانہ کا اثر تھا، اس سے ہر طرف علم کی روشنی پھیلتی رہی، ہر شہر و بستی میں علمی و تحقیقاتی سرگرمیاں پروان چڑھتی رہیں، ہر موضوع پر نت نئی کتابیں بازار میں آتی اور کتب خانوں میں پہنچتی تھیں، کتب و کتب خانہ ہر پڑھے لکھے کا ایسا ہر دلعزیز مشغلہ بن گیا تھا کہ اس کے بنائے رکھنے اور دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچانے کے لئے وہ اپنی عمر عزیز کا معتدبہ حصہ کتابوں کی نقل، تصحیح و مقابلہ میں صرف کرتا، پھر اسے کتب خانوں میں وقف کرتا تھا، ان کتب خانوں کی طلب و رسد جن ذرائع سے پوری ہوتی، اور کتاب جن منازل سے گزر کر کتب خانوں میں پہنچنے کے لائق ہوتی تھی، اس مقالہ میں اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی، اسی لئے اس کا عنوان "کتاب سازی، وراقت" رکھا گیا، پہلے کاغذ سازی، اس کے اقسام، صنعت کاغذ سازی کے مراکز، کاغذی مقامی نسبتوں سے شہرت، بہترین کاغذ کی پہچان، سامان کتابت، قلم، دوات، سیاہی، نقل و ضبط کا اہتمام، کتابت و خوشنویسی، اقسام خط، تحریر و کتب شناسی، شعبہ و مدرسۂ خوشنویسی کا قیام، کتابوں میں اعراب کا اہتمام، مقابلہ کتاب، تخریج و الحاق نقص، عبارت قلم زد کرنا، مٹانا، قواعد صحت کتاب و احتیاطی پہلو، تصحیح میں احتیاط و اصطلاحات، کاتبوں کا ضابطۂ اخلاق، ناقل و کاتب کی شروط سے بحث کی گئی ہے، آئندہ کسی شمارے میں صنعت وراقت، سوق الوراقین کی نوعیت، کثرت، مراکز، ان کی علمی و ثقافتی حیثیت، تجارت کتب، کتب فروشوں کی خصوصیات، فروغ تجارت کتب کے عوامل، معیاری و مستند ناشرین، گراں و ارزاں قیمت، انتخاب کتب کے اصول و مبادی اور تبصرۂ کتب پر روشنی ڈالیں گے، اس لئے کہ عہد عباسی میں کتابوں کا ان تمام پہلوؤں سے

جائزہ لیا جاتا تھا، ان مراحل سے گزرنے کے بعد کتاب کتب خانہ میں جگہ پاتی اور اہل علم کے استفادہ کے لائق سمجھی جاتی تھی، اس سے عہد عباسی کے اس علمی و ثقافتی ورثہ کی قدر و قیمت اور استنادی حیثیت کی وضاحت ہوتی ہے جو کتب خانوں میں طلبہ، اساتذہ، محققین و شائقین کتب کے استفادہ کے لئے رکھا جاتا تھا، عہد عباسی کی یہ وہی تحقیقات اور جدتیں تھیں جنھیں یورپ کی ترقی اور موجودہ تحقیقات کی اساس بننے کا فخر حاصل ہے۔

کاغذ اردئے کاغذ کی ایجاد اور اس کی صنعت کے ادلین خط و خال سے بحث ہمارے مقالہ کا موضوع نہیں ہے، اس لئے ہم عہد عباسی میں مواد کتب سے روشناس کرانے کے لئے اس کا سرسری جائزہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، کاغذ کی صنعت نے سلطنتوں کو چاندی اور سونے کے سکوں کے بوجھ سے ہلکا کرنے کے لئے زر کاغذی مہیا کیا، اور علمی و ادبی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا، یہ کہنا بجا ہے کہ کاغذ ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس نے قدیم و جدید علمی سرمایہ کو منتقل کرنے، محفوظ رکھنے، اسے آئندہ نسلوں تک پہنچانے، پروان چڑھانے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے، مسلمانوں نے جب اس صنعت سے دنیا کو روشناس کرایا، علمی و ثقافتی ورثہ اسی کاغذ پر منتقل ہوتا رہا، اور ہوتا رہے گا، پیپائرس کا آج تاریخوں میں نام ضرور روشن ہے لیکن ہماری لائبریریاں اس سے خالی ہیں، بابل و نینوا کی کھدائی سے جو الواح دریافت ہوئی ہیں، وہ اگر تواتر کے ساتھ نقل ہوتی رہتیں تو بھی یہ نئی دریافت بنی نوع انسان کے لئے ناگزیر تھی، اس اعتبار سے کاغذ ہی وہ مواد کتابت ہے جس نے ناپائیداری کے باوجود اپنی ارزانی، فراوانی کے سبب ہر نوع کے قدیم و جدید علمی سرمائے کو ہم تک بآسانی منتقل کیا، تحریک احیائے علوم و فنون و تحریک کتب خانہ سازی کو حیات جاوید عطا کی اور گھر گھر کتب خانہ قائم کیا۔

عہد قدیم سے جن متمدن اقوام میں نوشت و خواند کا آغاز ہوا اور تھوڑا بہت چرچا رہا تھا ان میں مصری رومی، فارسی، ہندی، چینی، یونانی، عرب سب ہی شامل تھے، انھوں نے جو مواد لکھنے کے لئے انتخاب کیا تھا اس کا تذکرہ ابن الندیم نے الفہرست میں کیا ہے، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان نے لکھنے کے لئے مٹی، پتھر، لکڑی، تانبا، درخت کے پتے، چھال، گھاس، چمڑا، ہڈی، کپڑا اور اوراق بردی (Papyrus)

اور چینی کاغذ سب ہی کچھ استعمال کیا تھا، چنانچہ اشور بانی پال کا پورا کتب خانہ گلی تختیوں (Clay Tablets) پر مشتمل تھا[1]، یونانی چمڑے پر[2]، رومی سفید ریشم، نرم کھال اور اوراق بردی پر، جنگلی گدھے کے چمڑے پر، اہل فارس بھینس، گائے اور بکری کی کھال پر، عرب اونٹ کے شانہ کی ہڈی، سنگ سفید کے ٹکڑوں، کھجور کی چوڑی چکنی ٹہنیوں[3] اور چمڑے پر بھی لکھتے تھے[4]، چینی گھاس سے تیار کردہ کاغذ پر لکھتے تھے[5]، اہل ہند تانبے، پتھر اور سفید ریشم پر لکھا کرتے تھے[6]، فوری ضرورت کے لئے لوگ لکڑی اور درخت کی پتیوں کو تحریر کے لئے استعمال کرتے اور تحریر کو تا دیر رکھنے کے لئے توز کے پتوں پر لکھتے تھے[7]،

مذکورہ بالا اشیا میں کچھ اپنی ناپائیداری، ناہمواری، کمیابی، سختی، گرانی نقل و حمل کی دقت، ذخیرے کے لئے زیادہ جگہ کی احتیاج و غیر معمولی محنت کے بعد کارآمد بنانے کی وجہ سے زیادہ استعمال میں نہیں آسکی تھیں اس لئے ان متمدن اقوام میں نوشت و خواند کا سلسلہ ہمیشہ نہایت مختصر و محدود طبقہ میں دائر و سائر تھا، اور کتب خانوں کی تعداد دہائیوں سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی، اہل مصر لکھنے کے لئے پیپائرس (Papyrus) جو گھاس سے تیار کیا جاتا تھا، استعمال کرتے تھے[8]، عربی میں قرطاس، اوراق بردی سے بھی معروف ہے۔

قرطاس (مفرد) بکسر قاف بمعنی پیپائرس، بردی اور قراطیس (جمع) بفتح قاف قرآن میں آیا ہے (الانعام

---

[1] دی انسائیکلوپیڈیا امریکنا، ۱۹۸۰، ایڈیشن، جلد ۲، ص ۲۵۸ [2] کتاب البیرونی فی تحقیق ماللہند من مقولۃ فی العقل او مرذولۃ، حیدرآباد الدکن، مطبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیۃ، ۱۳۷۷ھ، ص ۱۳۳، [3] الفہرست لابن الندیم ص ۳۱، صبح الاعشیٰ للقلقشندی، ج ۲ ص ۴۸۴، [4] کتاب البیرونی فی تحقیق ماللہند، ص ۱۳۳، [5] الفہرست لابن الندیم ص ۳۱ کتاب البیرونی فی تحقیق ماللہند ص ۱۳۳، صبح الاعشیٰ للقلقشندی، ج ۲ ص ۴۸۵-۴۸۶، [6] کاغذ سازی از مولانا محمد ظفر ندوی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، اعظم گڑھ، دار المصنفین ۱۹۶۳ء ص ۲۲۱-۲۲۲، کتاب الفہرست لابن الندیم، ص ۳۱ و ۳۲ و ۳۳، [7] کتاب البیرونی فی تحقیق الہند، ص ۱۳۳، [8] الفہرست لابن الندیم ص ۳۱۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

۷-۹۱) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل عرب قرطاس سے آشنا تھے، یہ کارٹس (Chearts) کا معرب ہے[1]
پہلی اور دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کاغذ کی نشر و اشاعت سے قبل مسلمانوں میں قرطاس کا استعمال
رہا اور کاغذ کے رواج پذیر ہونے کے بعد بھی قرطاس و قراطیس مصر کی نسبت کی صورت میں بلاشبہ اوراق بردی
کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن مصر کی نسبت کے بغیر بلا قرینہ ہمیشہ کاغذ کے معنی میں آیا ہے، چنانچہ بغداد کا
محلہ درب القراطیس کاغذ سازی کی وجہ سے مشہور تھا[2]، اسلامی قلمرو میں کاغذ و محلہ کاغذ سازاں دونوں کی اسی
معنی و نسبت سے شہرت ہے، اور یہی وہ مقامات تھے جہاں کاغذ ساز رہتے اور کاغذ بنتا تھا، اسی لئے زمخشری نے
مقدمۃ الادب[3] میں اور میدانی نے السامی[4] میں قرطاس کا ترجمہ لفظاً کاغذ سے کیا ہے، کاغذ یا کاغد جس کی جمع
کواغذ[5] اور کواغید آتی ہے[6]، امام لغت صغانی لاہوری نے تصریح کی ہے کہ یہ لفظ عربی میں فارسی زبان سے آیا ہے[7]
لیکن دراصل یہ چینی زبان کا لفظ ہے، بقول لوفر (Laufar) یہ (Ku-Chih) اور
قدیم چینی زبان میں (Kokoi-Kokoz) سے کاغذ بنا ہے، اور فراء کی رائے یہ ہے کہ ممکن ہے یہ لفظ ترکی
ہو[8]، یہ چونکہ چینی ترکستان کا علاقہ تھا اس لئے اسے ترکی الاصل کہنا بھی درست ہے، قراطیس اور کاغذ کی طرف
نسبت کی وجہ عہد عباسی میں کاغذ سازی کی صنعت میں مہارت و کاغذ فروشی میں شہرت کی بنا پر اہل علم کو قراطیسی[9]
کاغذی[10] اور وراق[11] کی نسبتوں سے شہرت حاصل ہے، دمشق میں آج بھی ایک خانوادہ قراطیسی کی نسبت سے مشہور

---

[1] Dozy, Supplement anx Dictionnaires arabes leide
GI-denent E.J.Brill Vol.2.P331

[2] تاریخ بغداد للخطیب ج ۲ ص ۱۹، [3] مقدمۃ الادب للزمخشری گردآوردہ محمد کاظم امام، تہران، چاپخانہ دانشگاہ ۱۳۴۲ھ
ص ۲۶، [4] السامی فی الاسامی للمیدانی تحقیق محمد موسی ہنداوی، بیروت، محمد موسی ہنداوی، ۱۹۶۷ء ص ۲۹، [5] لطائف المعارف
الثعالبی کتاب البیرونی فی تحقیق ما للہند، ص ۱۳۳، [6] لطائف المعارف للثعالبی ص ۲۱۶، ۲۱۸ (ل) ثمار القلوب فی المضاف
والمنسوب تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم الابیاری، القاہرۃ، مطبعۃ المدنی ۱۳۸۴ھ ص ۵۳۱، [7] تاج العروس للمرتضی الزبیدی
ج ۲ ص ۴۸۶، [8] لغت نامہ دہخدا، شمارہ مسلسل ۱۰۷، شمارہ حرف کاف ۳ ص ۲۱، [9] الانساب للسمعانی ورق ۴۴۵
[10] ایضاً، [11] ایضاً ورق ۴۰۹ ب

ہے، اس خاندان کے افراد کاغذ کی تجارت کرتے ہیں[1]، عہد عباسی میں کتب فروش پر قراطیسی کی طرح کراریسی کا
لفظ بھی بولا جاتا تھا، لیکن جلد ہی لفظ "وراق" نے ان کی جگہ لے لی تھی، اس سے بعض اہل لغت کی رائے یہ ہے کہ
وراقت کا دائرہ تجارت کتب تک محدود نہیں تھا، بلکہ کتاب و سامان کتابت، ورق، کتابت، نقل، کتابوں کی
سلائی، جلد سازی ہر چیز پر اس کا اطلاق ہوتا تھا[2]۔

دنیا میں سب سے پہلے ۱۰۵ عیسوی میں ایک چینی سائی لون[3] (زائی لون) (Tsai-Lun)
نے گھاس سے کاغذ تیار کیا تھا[4]، ابن الندیم نے چینی کاغذ ابن ابی الحریش کے خزانۃ الکتب میں دیکھا تھا[5]، مسلمانوں
نے اس صنعت کو ان سے سیکھا اور کتان (السی) اور قطن (روئی) سے کاغذ تیار کیا[6]۔

کاغذ سازی کا آغاز دور اموی میں ہو چکا تھا[7]، اس امر کا اعتراف اس عصر کے نامور محقق کرد علی کو بھی ہے[8]
علامہ شہاب الدین ہارون بن بہاء الدین مرجانی المتوفی ۱۳۰۶ھ نے وفیات الاسلاف میں تصریح کی ہے کہ
یوسف بن عمر مکی نے قتیبہ بن مسلم کی فتح سمرقند ۹۳ھ[9] کے بعد ۹۵ھ کے حدود میں حجاز میں روئی سے
کاغذ بنایا تھا[10]، اسی کاغذ کو ابن الندیم نے "ورق تہامی" کے نام سے ذکر کیا ہے، جو اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ
ابن ابی الحریش کے خزانۃ الکتب میں دیکھا تھا[11]، ہمارے علم میں نہیں کہ ابن الندیم کے علاوہ کسی مورخ نے تہامی
کاغذ کا تذکرہ کیا ہو، اگر ابن الندیم نے ورق تہامی کو نہ دیکھا ہوتا تو علمی دنیا کو اس کا نام بھی معلوم نہ ہوتا۔

---

[1] الکتاب فی الاسلام، الفکر الاسلامی، شمارہ ۱۲، ۱۹۷۱ء، ۱۲، [2] صبح الاعشیٰ ج ۲ ص ۴۸۲-۴۸۳، [3] سید سلیمان ندوی
چینی، چین و عرب کے تعلقات اور ان کے نتائج، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۳ء ص ۳۶۲، [4] خطط الشام محمد کرد علی ج ۴
ص ۲۴۲، The Encyclopaedia Americana, 1968 ed, Vol. 21, P. 258
Encyclopaedia of Library and Informations Science
New York Marcel Dekker, Inc., 1977 Vol.2, P.45.46,385
[5] الفہرست لابن الندیم، ص ۲۱، [6] ایضاً ص ۳۱، الورق والوراقۃ فی الحضارۃ الاسلامیۃ محمد طہ الحاجری مجلۃ المجمع
العلمی العراقی، شمارہ ۱۲ (۱۳۸۳ھ) ص ۱۳۵، [7] ایضاً، [8] خطط الشام ج ۴ ص ۲۴۲، [9] فتوح البلدان
للبلاذری تحقیق عبداللہ انیس الطباع، عمر انیس الطباع، بیروت، دار النشر للجامعیین، ۱۳۷۷ھ ص ۲۹۲، [10] معجم البلدان لیاقوت
ج ۳ ص ۲۴۳

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف بن عمرو مکی کے کاغذ سازی کا دائرہ حدود تہامہ سے آگے نہیں بڑھا، اس لئے اس کی جیسی شہرت چاہیے تھی نہ ہوسکی، اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کاغذ سب سے پہلے حجاز کی سرزمین میں تیار کیا گیا ہو تو کچھ مستبعد نہیں۔ بلاد مغرب میں موسیٰ بن نصیر المتوفی ۹۷ھ/۷۱۵ء نے قنب (سن) اور کتان سے کاغذ بنانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا،[۵] اس سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ برِ اعظم ایشیا اور یورپ میں مسلمانوں نے کاغذ سازی کا سلسلہ شروع کیا تھا، ۱۳۴ھ/۷۵۱ء میں جنگ اطلخ میں امیر زیاد بن صالح حارثی المقتول ۱۳۵ھ/۷۵۲ء کچھ چینی کاغذ سازوں کو اسیر بنا کر سمرقند لے آئے، چینی کاغذ گھاس سے بناتے تھے، مسلمانوں نے کاغذ قطن (Cotton) سے بنایا،[۶] جو قطنی کاغذ کہا جاتا تھا، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ پرانی رسیوں کے فرسودہ ٹکڑوں سے بنایا جاتا تھا،[۷] آدم مِنز کی تحقیق یہ ہے کہ برگ توت اور خاب ہندی سے بنایا جاتا تھا،[۸]

اہل سمرقند نے چینی کاغذ ساز اسیروں سے کاغذ بنانا سیکھا، پھر بلاد مشرق میں اس صنعت کو بہت فروغ حاصل ہوا، اس لئے اس کا انتساب چینی کاغذ سازوں کی اسیری کے واقعہ سے ہو کر رہ گیا،[۹] اور کاغذ سازی کی صنعت کو عہد عباسی کی ادبیات سے شمار کیا جانے لگا، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس واقعہ کے بعد کاغذ سازی کی صنعت کو بتدریج پورے اسلامی قلمرو میں کاشغر سے غرناطہ تک ترقی کرنے کی سہولتیں حاصل ہوتی رہیں، اس صنعت میں مسابقت کا جذبہ ابھرا، مشرق و مغرب کے کم و بیش ہر بڑے شہر میں کاغذ سازوں کے کوچے محلے اور بازار آباد ہوگئے تھے، ۱۹۲ھ/۷۹۴ء میں بغداد میں بازار الکتب کے قیام سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۵) ۱۰ التراتیب الاداریہ والعمالات والصناعات والمتاجر والحالۃ العلمیہ التی کانت علی عہد تاسیس المدینۃ الاسلامیۃ فی المدینۃ المنورۃ العلمیہ لعبد الحی الکتانی، بیروت، احیاء التراث العربی، ب ت، ج ۲ ص ۲۴۲، ۱۱ الفہرست لابن الندیم ص ۲۱، ۱ التراتیب الاداریہ، ج ۲ ص ۲۴۲، ۲ بلاد فلسطین وشام ازلی استرنج ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی، حیدرآباد دکن، مطبع سرکار عالی، ۱۳۵۴ھ، ص ۱۰۱، خطط الشام، ج ۴ ص ۲۴۳، ۳ بلاد فلسطین وشام ص ۱۰۱، ۴ الحضارۃ الاسلامیہ لآدم مز، ج ۲ ص ۲۶۹، عنایت اللہ، کاغذ کا رواج، تاریخ کی روشنی میں، مجلہ جامعہ عباسیہ بہاولپور، شمارہ ۱ ۱۳۸۲ھ، ص ۹۵، ۵ ثمار القلوب ص ۴۴۳، (ب) لطائف المعارف ص ۲۱۸، کتاب البیرونی ص ۱۳۳، آثار البلاد واخبار العباد زکریا بن محمد القزوینی، بیروت، دار صادر، ۱۳۸۰ھ، ص ۵۳۶، الحضارۃ الاسلامیہ لآدم مز، ج ۲ ص ۲۶۹، لغت نامہ دہخدا شمارہ مسلسل ۱۰۱

شہروں میں اس صنعت کا نہایت تیزی سے رواج ہو چکا تھا۔[۱۰]

کاغذ کی تین نسبتوں سے شہرت | عہد عباسی میں کاغذ کو اسلامی قلمرو میں تین نسبتوں سے شہرت حاصل تھی۔

(۱) بلاد کی نسبت سے، جیسے ورق سمرقندی (۲) کاغذ کے کارخانہ سازوں کی نسبت سے، جیسے ورق سلیمانی (۳) کاغذ سازوں کی نسبت سے، جیسے ورق منصوری۔

عہد عباسی میں جو ممالک و بلاد کاغذ کی صنعت کا مرکز رہے ہیں وہ حسب ذیل تھے:

(۱) ماوراء النہر: چنانچہ ابراہیم اصطخری کا بیان ہے کہ بلدان اسلام میں نوشادر اور کاغذ میں ماوراء النہر کے کاغذ کا جواب نہیں،[۱۱] اس سے[۱۲] ثابت ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں کاغذ کی صنعت پورے اسلامی قلمرو میں پھیل گئی تھی (۲) خراسان،[۱۳] خراسانی کاغذ کی شہرت اندلس تک پہنچی ہوئی تھی،[۱۴] نیشاپور میں سکۃ الوراقین تھا،[۱۵] (۳) بلخ: بلخی کاغذ اندلس تک مشہور تھا[۱۶] (۴) عراق: بغداد میں دوسری صدی ہجری کے ربع آخر میں فضل بن یحییٰ برمکی نے یہاں کاغذ سازی کا کارخانہ قائم کیا تھا،[۱۷] محلہ کرخ[۱۸] بغداد اور محلہ دار القز بغداد میں کاغذ تیار کیا جاتا تھا،[۱۹] سامرا میں خلیفہ معتصم نے مصری کاغذ سازوں کو آباد کیا تھا، انھوں نے کاغذ بنایا لیکن دبیز

(حاشیہ ص ۱۹۶) شمارہ حرف ک ص ۲۱، ۶ تحفۃ الالباب ونخبۃ الاعجاب ابو حامد الغرناطی ایبری نشنل پریس ۱۹۲۵ء ص ۲۰۲، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۱۲، ص ۱۳۷، ۷ ایضاً، ۸ رسالۃ الجد والہزل للجاحظ تحقیق عبد السلام محمد ہارون، القاہرہ الخانجی ۱۳۸۴ھ ص ۲۵۳ و ۲۵۴، ۹ المسالک والممالک از ابو اسحاق ابراہیم الاصطخری تحقیق محمد جابر عبد العال الحسینی، القاہرہ، وزارۃ الثقافۃ الارشاد القومی، ۱۳۸۱ھ، ص ۲۸۷، ۱۰ مسلمانوں کی صنعت حرفت، زراعت تجارت، مترجمہ محمد جمیل الرحمٰن الہ آباد پاکستان، ۱۹۶۳ء ص ۱۷، یہ قرآن کریم کی کتاب کا ترجمہ ہے ۱۱ تحفۃ الالباب الغرناطی ص ۲۰۳، ۱۲ تاریخ نیشاپور للحاکم النیشاپوری تلخیص احمد بن محمد المعروف بالخلیفۃ النیشاپوری، تہران کتابخانہ ابن سینا، ۱۳۳۷ ق، ۱۳ تحفۃ الالباب ص ۲۰۳، ۱۴ المقدمہ لابن خلدون ص ۵۵۰، لغت نامہ دہخدا، شمارہ مسلسل ۱۰۳، شمارہ ک ۳، ص ۲۱۴، صبح الاعشیٰ ج ۲، ص ۴۷۵ - ۴۷۶۔

نہ تھا[10]۔ تیسری صدی ہجری میں بغداد میں کاغذ بہت اچھا بنتا اور نہایت سستا بکتا تھا، چنانچہ محمد بن غالب بصری ثم بغدادی المعروف بغنام المتوفی ۳۲۳ھ کے پاس چند طلبہ حدیثیں لکھنے کے لئے آئے، موصوف نے بستے نکالکر سامنے رکھے، وہ پرانے کاغذ پر لکھنے لگے، غنام بولے، یا بنی الکاغذ رخیص ببغداد، فلو کتبتم علی کاغذ اجود من ہذا[11] بیٹے، بغداد میں کاغذ سستا ہے، کاش تم اس سے بہتر کاغذ پر لکھتے، پانچویں صدی ہجری میں کاغذ کی صنعت بغداد میں بہت عروج پر تھی[12]، واسط میں بھی درب القراطیس تھا[13] (۵) شام۔ یہاں اچھا کاغذ بنتا اور مصر بھیجا جاتا تھا[14]، شام کے حسب ذیل شہروں میں کاغذ بنایا جاتا تھا[15]، دمشق[16]، طبریہ[17]، فلسطین[18]، اوائل عہد عباسی میں لکھنے کے لئے چمڑا بھی استعمال میں آتا تھا، لیکن چمڑے کی بہ نسبت کاغذ پر تحریری مواد زیادہ آتا ہے، یہ سستا اور ہر وقت بآسانی میسر، سبک، نقل وحمل میں آسان، ان وجوہ سے مسلم معاشرے میں اسے قبول عام حاصل ہوا اور چمڑے کا چلن جاتا رہا، کاغذ کی موجودگی میں اگر کوئی چمڑا استعمال کرتا، معاشرہ میں حیرت وتعجب سے دیکھا جاتا، اس سے سوالات کئے جاتے، چنانچہ جاحظ سے بھی سوال کیا گیا، اس نے مناقبہ انداز میں چمڑے کی خوبیوں اور خرابیوں کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

---

۹ اخبار الراضی باللہ والمتقی للہ للصولی، القاہرہ طبع ح بیروت، د.ن، ۱۹۳۵ء، ص ۲۶۰، (بقیہ نوٹ ۱۹۵) ۱۰ معجم البلدان لیاقوت، ج ۲ ص ۳۲۲، مراصد الاطلاع علی الامکنۃ والبقاع لعبد المومن ابن عبد الحق البغدادی تحقیق علی محمد البجاوی القاہرہ: عیسی البابی والحلبی ۱۳۷۳ھ، ج ۱ ص ۵۰۷، ۱۱ مسلمانوں کی صنعت، ص ۶۷، ۱۲ تاریخ بغداد للخطیب، ج ۳ ص ۴۶، ۱۳ العامة ببغداد فی القرن الخامس الہجری، بحث تاریخی فی الحیاة الاجتماعیة لجماہیر، تالیف محمد منیر الکعبدی، بغداد، مطبعة الارشاد، ۱۳۸۷ھ، ص ۵۰، ۱۴ مصطفی جواد المواد الصناعیة من معجم الادباء، ص ۶۲، ۱۵ خطط الشام لمحمد کرد علی، ج ۴ ص ۲۴۳، معجم الاعشی، ج ۲ ص ۲۸۷، نزہة الانام فی محاسن الشام لعبد اللہ بن محمد البدری الدمشقی، مصر، المطبعة السلفیة، ۱۳۴۱ھ، ص ۳۴۲، ۱۶ بلاد فلسطین وشام، ص ۲۰، الحضارة الاسلامیة لآدم متز، ج ۲ ص ۲۴۹، ۱۷ احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم للمقدسی، لندن، مطبعة بریل، ۱۹۰۶ء، ص ۱۸۰، الحضارة الاسلامیة لآدم متز، ج ۲ ص ۲۴۹، علی ساقی "اختراع کاغذ" ہنر ومردم شمارہ ۱۱۵ (۱۳۵۱ ف) ص ۲۵-۲۶، ۱۸ خطط الشام، ج ۴ ص ۲۴۲۔

تم کہتے ہو کہ تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم نے اپنی تمام کتابیں چینی وخراسانی کاغذ پر تیار نہیں کرائیں، تم تعجب کرتے ہو کہ تم نے چمڑے پر کیوں لکھوایا، تم کیوں اس کی ترغیب دیتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ اس کا حجم خشک ہو کر (کمتر ہو جاتا ہے) وزن ثقیل ہے، اگر پانی پہنچ جائے تو خراب ہو جائے، اور نمی کے دن ہوں تو ڈھیلا ہو جائے، ڈھیلا بھی نہ ہو تو چمڑے والے نزولِ باراں کو پسند نہیں کرتے، وہ بارش سے خوش نہیں ہوتے تمھیں معلوم ہے، وراق ان ایام میں ایک سطر بھی نہیں لکھتا، نہ چمڑا کاٹتا ہے جب وہ تر ہو، پھر بارش بھی ہو جائے بھیگ بھی جائے، ڈھیلا ہو کر دراز ہو جائے، پھر جب خشک ہو جائے پھر کھنچ تان کے بعد اپنی پہلی حالت پر لوٹتا ہے، زیادہ بدبودار، زیادہ گراں قیمت ہو جاتا ہے، وہ دھوکے کا زیادہ متحمل ہوتا ہے، اسلئے کوفی کو واسطی اور واسطی کو بصری بنا لیا جا سکتا ہے، اسے پرانا کیا جا سکتا ہے تاکہ اس کی بو دور ہو جائے، اس کے بال صاف ہو جائیں، اس میں گرہ زیادہ ہوتی ہیں، یہ زیادہ تر غبار آلود ہوتے ہیں اور بیشتر ناکارہ سیاہی اس میں جلد پہنچتی ہے، اس میں تحریر کا زیادہ جلدی مٹ جانا زیادہ عام ہے، صاحب کتب خانہ یہ چاہے کہ بقدر حاجت کتابیں سفر میں ساتھ رکھے تو اس کے لئے بار شتر بھی کافی نہیں، قطنی کاغذ کی کتابیں بار شتر بھی سفر میں ساتھ لے جانا چاہے تو یہ بھی اسے کفایت کرتا ہے۔

تم نے مجھے بتایا ہے کہ یہ تغیر وتبدل کو زیادہ برداشت کرتی ہیں، زمانۂ دراز تک عاریۃ لینے دینے اور ہاتھوں میں گھومتے پھرتے رہنے سے ان میں کوئی فرق نہیں آتا، اس کی پھر بھی قیمت اٹھتی ہے اور پھٹا ہوا بھی کام آتا ہے، اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اسے پھر زندہ کیا جاتا ہے، گڈہ بھرنے کی نیابت کرتا ہے، قطنی کاغذ کی بازار میں قیمت نہیں ہے (بہت سستا ہے) تم اگر بازار والوں کو ورق یا پورا چمڑا پیش کرو اور اس پر بال لگے ہوں اور بیکار باتیں بھی لکھی ہوں تو بھی زیادہ قیمت اٹھے گی اور لوگ خریداری میں جلدی کریں گے،

میں کہتا ہوں حساب کتاب چمڑوں پر لکھا جاتا ہے، دفتروں میں چمڑوں پر لکھی ہوئی تحریروں پر اعتماد کیا جاتا ہے، عہد وپیمان، شرائط، بیع وشرا کے معاملات، زمینوں کی خرید وفروخت سے متعلق امور چمڑوں پر لکھے جاتے

ہیں، نقشے انہی پر بنائے جاتے ہیں، پھر دیمک کاغذ کو جلد کھا جاتی ہے،[۱۵]

حماۃ، حلب،[۱۲] منبج،[۱۳] طرابلس الشام،[۱۴] یہاں کا کاغذ سمر قندی کاغذ کی طرح تھا (۶) مصر: یہاں کے کاغذ سازوں کی بھی شہرت تھی، اسی لیے معتصم نے یہاں سے کاغذ سازوں کو سامرا میں آباد کیا تھا،[۱] فسطاط: یہاں خط (بستی) بنی (یہ میں باب القنطرہ کے قریب مقریزی المتوفی ۸۴۵ھ کے زمانے تک کاغذ بنایا جاتا تھا،[۲] قاہرہ، حارہ بہاء الدین اور سویقہ امیر الجیوش کے درمیان خط خان وراقہ میں کاغذ تیار کیا جاتا تھا[۳] (۷) ایران: خونا میں جس کا تذکرہ کتابوں میں خوبخ کے نام سے کیا جاتا ہے، کاغذ کا کارخانہ تھا[۴] (۸) ہندوستان میں بھی کاغذ تیار کیا جاتا تھا، اس کاغذ کی صدائے بازگشت اندلس تک سنائی دیتی ہے، اور ابو حامد غرناطی نے ہندوستان کے ساختہ کاغذ کو بلخ و خراسان کے ہم پایہ کاغذ قرار دیا ہے،[۵] ممکن ہے یہ کاغذ کشمیر، سیالکوٹ اور لاہور میں کسی جگہ بنتا ہو (۹) مغرب: اندلس، مشرق (ایشیا) سے کاغذ کی صنعت مسلمانوں کے ذریعہ مغرب میں پہنچی، چنانچہ قرطبہ میں بے نظیر،[۶] شاطبہ میں نہایت عمدہ اور صقلیہ (سسلی) میں بھی کاغذ بنایا جاتا تھا،[۷] سولہویں صدی عیسوی میں یہاں سے کاغذ سازی کی صنعت یورپ کے مغربی ممالک میں پہنچی تھی،[۸]

ابن الندیم نے چوتھی صدی ہجری تک اسلامی دنیا میں حسب ذیل چھ قسم کے کاغذوں کی نشاندہی کی ہے:

(۱) سلیمانی (۲) طلحی (۳) نوحی (۴) فرعونی (۵) جعفری (۶) طاہری[۹]

---

۱۵ رسالۃ الجد و الہزل للجاحظ تحقیق عبد السلام محمد ہارون، القاہرہ: مکتبۃ الخانجی، ۱۳۸۴ھ، ص ۲۵۳-۲۵۷، ۱۲ خطط الشام از کرد علی ج ۴، ص ۲۴۴، ۱۳ ایضاً ص ۲۴۲، ۱۴ سفرنامۂ ناصر خسرو تحقیق محمد دبیر سیاقی، تہران کتاب فروشی زوار، ۱۳۵۴ ف، ص ۱۵، ۶ ج ۲ ص ۲۶۹، ۵ البلدان لاحمد بن واضح الیعقوبی ط ۳۰، النجف، المطبعۃ الحیدریہ، ۱۳۷۷ھ، ص ۲۹، ۶ الخطط المقریزیہ، ج ۱ ص ۷۰۶، ۷ ایضاً ج ۲ ص ۲۳۲، ۸ معجم البلدان یاقوت ج ۲ ص ۶۷، مراصد الاطلاع لابن عبد الحق ج ۱ ص ۴۰۲، ۹ تحفۃ الالباب للغرناطی، ص ۲۰۲، ۱۰ لغت نامہ دہخدا، شمارہ حرف ک، ۳، ص ۲۱۵، ۱۱ معجم البلدان، ج ۲ ص ۹۰، الحضارۃ الاسلامیہ لآدم متز ج ۲ ص ۲۹۹، ۱۲ مسلمانوں کی صنعت و حرفت، ص ۴۳، ۱۳ الحضارۃ الاسلامیہ، ج ۱ ص ۲۲۷، لغت نامۂ دہخدا شمارہ حرف ک ۳، ص ۲۱۵، ۱۴ الفہرست لابن الندیم، ص ۳۲،

بہترین کاغذ کی پہچان | علامہ ثعالبی (۳۵۰ - ۴۲۹ھ) نے عہد عباسی میں اسلامی قلمرو میں کاغذوں میں سمر قندی کاغذ کو سب سے زیادہ بہتر، سب سے زیادہ نرم، سب سے زیادہ لطیف اور سب سے زیادہ باریک و صاف قرار دیا ہے،[۱] موصوف نے جن خوبیوں کی بنا پر اس کو سب سے بہتر و اعلیٰ معیار کا کاغذ قرار دیا ہے، اسی معیار پر نویں صدی ہجری میں ابو العباس احمد القلقشندی المتوفی ۸۲۱ھ = ۱۴۱۸ء نے بغداد کے کاغذ کو سب سے بہتر اور فرنگی کاغذ کو سب سے بدتر قرار دیا،[۲] بغداد کے بہترین کاغذ کی تصدیق گیارہویں صدی ہجری میں رضی الدین محمد بن حسن قزوینی المتوفی ۱۰۹۶ء کے بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ کہتا ہے:

"ہم نے تمام شہروں کے کاغذ کا تجربہ کیا ہے مگر سب سے زیادہ عمدہ دیرپا، مضبوط کاغذ بغداد، دمشق، آمل اور سمر قند کا پایا جو لکھنے کے لائق ہیں، دوسرے شہروں کے کاغذ ناپائیدار ہیں، وہ ایک زمانے کے بعد ترخ جاتے ہیں،[۳]

روئی سے کاغذ کی ایجاد اور اس کی فروغ تجارت نے معاشی اعتبار سے مسلمانوں کو خوشحال بنایا، ان کے علمی ورثے سے دوسروں کو بہرہ مند کیا، ذہنی تنویر بخشی، چنانچہ پاپائیت جس نے علم کو ایک مخصوص طبقے تک محدود کر دیا تھا، اور عیسائی حکمرانوں کی رعایا اوہام پرستی و تعصب میں مبتلا تھی، مسلمانوں کی کاغذ کی تجارت نے توہم پرستی اور تعصب سے کسی حد تک دور رکھا، چنانچہ کاغذ جوں جوں پھیلتا گیا کتابیں وجود میں آتی گئیں، علم کی روشنی سے لوگوں کے دماغ روشن ہوتے رہے اور کاغذ کی ارزانی اور فراوانی کی وجہ سے ہر طبقہ کے لوگوں کو کاغذ اور کتاب کی خریداری میں کوئی تامل نہیں رہا، ہر شخص آسانی سے کاغذ و کتاب خریدتا، پڑھتا اور علمی دولت سے مالا مال ہوتا تھا، معاشرہ میں روز افزوں شرح خواندگی میں اضافہ کی وجہ سے دنیا سے جہل، تنگ نظری اور اوہام پرستی کا خاتمہ ہونے لگا تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ عیسائی

---

۱ لطائف المعارف للثعالبی ص ۲۱۸، ۲ صبح الاعشیٰ للقلقشندی، ج ۲ ص ۴۷۵، ۳ رسالہ خط از رضی الدین محمد قزوینی پرویز از کابل ہنر و مردم، شمارہ ۸۵ (امان ماہ، ۱۳۴۴ ف) ص ۵۱،

دنیا سے تعصب و اوہام اور جہل کے پردوں کو چاک کرنے میں مسلمانوں کی کاغذ سازی کی صنعت کا بڑا دخل ہے، چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف وان کریمر کو بھی ہے، وہ کہتا ہے کہ یوں علم و فن کی عام اشاعت اور اسکی ترویج کا سہرا عربوں ہی کے سر ہے، علوم کی اشاعت برابر بڑھتی گئی اور عربوں کا لگایا ہوا پودا اس قدر بارآور ہوا کہ اس کی بدولت مذہبی تعصب و اوہام پرستی اور بے جا تحکم کا بالکل خاتمہ ہوگیا، مختصر یہ ہے کہ اس وقت سے تمدن کا ایک نیا دور شروع ہوا۔"[1]

بریفالٹ نے کاغذ کی ایجاد و ترویج کی دادِ تحقیق حسب ذیل الفاظ میں دی ہے:

"یہ قابل غور اور حیرت انگیز حقیقت ہے کہ یونان اور روما جنھوں نے دنیا کی ہیئت کاملاً بدل کر رکھ دی اور تہذیب کی ایک نئی کائنات ایجاد کردی، ایک بھی اہم علمی ایجاد یا صنعتی اکتشاف نہ کر سکے . . . بابل و مصر کے اولین ایام سے لے کر کسی اہم اور نئے مادی اکتشاف کا سُراغ نہیں ملتا تا آنکہ عربوں نے یورپ میں کاغذ سازی بارود سازی اور ناخداؤں کے قطب نما کو رواج دیا، جس دانش و بصیرت نے فکر و ذہن کی ایک ایسی نئی دنیا پیدا کردی جو مشرق کے مقابلے میں ایسی ہی تھی جیسے آدھی رات کے مقابلے میں دوپہر۔"[2]

بریفالٹ ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے "عربوں نے یورپ میں اپنی تین ایسی ایجادیں رائج کیں جن میں سے ہر ایک نے دنیا میں عجیب انقلاب پیدا کردیا، اول ناخداؤں کی قطب نما جس کی برکت سے یورپ دنیا کے کناروں تک پھیل گیا، دوم بارود جس نے زرہ بکتر پہننے والے نائٹوں کے اقتدار کا خاتمہ کردیا، سوم کاغذ جس سے اشاعت و طباعت کا رستہ صاف ہوا، کاغذ کے رواج نے جو انقلاب پیدا کیا وہ اہمیت میں طباعت کی ترویج سے کم نہ تھا۔"[3]

---

[1] مسلمانوں کی صنعت از وان کریمر ص۳۰۔ [2] تشکیل انسانیت، بریفالٹ، ترجمہ عبدالمجید سالک، بار دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۷ء ص ۲۳۰-۲۳۱۔

[3] تشکیل انسانیت ص ۲۴۲-۲۴۳، عربوں کا تمدن، جوزف ہیل۔

اسلام نے تجارت و دستکاری پر زور دے کر ان کو بھی عبادت بنا دیا تھا، اس لئے مسلمان ہر نئی صنعت سیکھتے، اسے اپناتے، اس میں جدت پیدا کرتے اور خوب ترقی دیتے تھے، جوزف ہیل کہتا ہے:

"اسلام نے دستکاری کے فوائد اور خوبیوں پر زور دے کر دستکاری اور تجارت کو ایک مذہبی شکل دے دی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں کہیں مسلمانوں کو کوئی نئی چیز ملتی تھی، وہ فوراً اسے اپناتے اور اس میں مزید وسعت و نشو و نما پیدا کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے جب سنا کہ اسلامی قلمرو کے کسی دور دراز حصے غالباً چین میں کاغذ تیار کیا جاتا ہے تو انھوں نے فوراً اس کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانے میں سمرقند کے اندر کاغذ سازی کا ایک کارخانہ جس میں غالباً چینی کام کرتے تھے قائم ہوگیا، انھیں ابھی کاغذ بناتے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ انھوں نے اس کے لئے چیتھڑوں اور کپڑوں کا تجربہ شروع کیا، ۷۹۴-۹۵ء میں بغداد میں کاغذ سازی کا سب سے پہلا کارخانہ قائم ہوا اور حکومت کے دفاتر میں کاغذ کا استعمال شروع ہوا، رفتہ رفتہ تمام سلطنت میں کاغذ سازی کے کارخانے جاری ہوگئے، جہاں نت نئے قسم کا کاغذ تیار ہوتا تھا، ریشم کا کاغذ، روئی کا کاغذ موٹے اور باریک، صاف کھردرا، سفید اور رنگدار کاغذ بننا شروع ہوا، بانس کے کاغذ اور چمڑے کا زمانہ ختم ہوا، الغرض اب لکھنے کے لئے اس سے کہیں سستا سامان میسر آتا تھا، یہ علوم و فنون اور ادب کے فروغ کے لئے ایک اچھا شگون تھا۔"[1]

مشرق و مغرب (ایشیا اور یورپ) میں علوم و فنون کے فروغ، کتابوں کی اشاعت اور کتب خانوں کے ترقی پذیر سلسلہ کے احیا کی خاطر اسلامی قلمرو میں کہیں بھی کاغذ کی صنعت و تجارت پر کسی قسم کا ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی نہیں لگائی گئی، اس سے کاغذ کی صنعت و تجارت کو ہر چھوٹے بڑے شہر میں فروغ حاصل ہوا اور علمی دنیا کو اس سے ترقی کرنے کا موقعہ ملا، چنانچہ وان کریمر کہتا ہے "عہد عباسی میں کاغذ کی تجارت پر کسی قسم کا ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی نہیں تھی، اس لئے بھی کاغذ کی تجارت کو بہت فروغ حاصل تھا۔"[2]

---

[1] عربوں کا تمدن، جوزف ہیل ترجمہ نذیر نیازی، دہلی مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۲-۱۰۳۔ [2] مسلمانوں کی صنعت و حرفت، ص ۶۳، ۶۵۔

وان کریمر دوسرے مقام پر لکھتا ہے "کاغذ سازی سے صنعت علوم وفنون کی اشاعت کو غیر معمولی ترقی ہوئی، اور اسی صنعت کی وجہ سے مسلمانوں نے یورپ کے بازاروں میں اپنا سکہ بٹھایا[1]، عربوں نے کاغذ سازی کی صنعت کو جلد ہی ترقی دی، کافی سستا اور اچھا کاغذ بنا کر ایشیا کے بازاروں سے گزر کر یورپ کے بازاروں کو بھی یہ کاغذ مہیا کرنے لگے، اس لئے علم وفن کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا[2]"

مسلمانوں نے علم جیسی بیش بہا چیز کو بلا امتیاز عام کیا، بلا اجرت ومعاوضہ معاشرہ میں پھیلا کر عوام میں علمی بیداری پیدا کی اور ان کا کتابوں سے رشتہ استوار سے استوار تر کر دیا، مسلمان حکمرانوں نے کاغذ سازی کی صنعت پر کہیں اور کبھی کسی قسم کا ٹیکس عائد نہیں کیا، اس سے صنعت کاغذ سازی کو اسلامی قلمرو میں ہر جگہ فروغ حاصل ہوتا رہا، کاغذ کی فراوانی رہی، ذخائر علوم کی سرعت سے تدوین ہوتی گئی، آسانی سے اور ہر موضوع پر فراوانی سے بازار میں کتابیں آتی رہیں، عام طور پر ارزاں قیمت ومناسب داموں میں ملتی رہی تھیں، کتب خانے بنتے رہے، اور انکی طلب ورسد پوری ہوتی رہی تھی،

کاغذ سازی کا ضابطۂ اخلاق | عہد عباسی میں کاغذ سازی کا بھی ضابطۂ اخلاق تھا، جس کی کاغذ ساز پابندی کرتے تھے، چنانچہ ابن امیر الحاج کا بیان ہے:

کاغذ ساز کو جو کام سپرد کیا جائے اسے دیانتدارانہ طور پر انجام دینا چاہئے شلاً کاغذ کا دستہ تین درہم میں فروخت ہوتا ہو تو وہ خریدار کو چار درہم میں نہ بیچے، ہر نوع کے کاغذ کی جداگانہ قیمت ہوتی ہے، ہر نوع کے کاغذ کے دام میں فرق ہوتا ہے، چنانچہ سفید، کم سفید، صیقل کیا ہوا اور کم صیقل کیا ہوا مانجھا ہوا اور کم مانجھا ہوا، ایک دام کا نہیں ہوتا، پھر کاغذ کی ساخت کے اعتبار سے بھی قیمت میں تفاوت ہوتا رہتا ہے، گرم و سرد موسم کے اعتبار سے بھی قیمت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اس لئے کاغذ فروش پر لازم ہے کہ ہر کاغذ کی صنعت خریدار کو بتائے، تاکہ اس کو کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے، ایسا نہ کرنا خریدار کو دھوکا دینا ہے، جس کے متعلق حدیث

[1] مسلمانوں کی صنعت، حرفت، ص ۶۳ و ۶۵، [2] ایضاً،

میں وارد ہے مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا جس نے ہم کو دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

خریدار کو کارخانہ میں جاکر کاغذ دیکھنے کا حق ہے، لیکن کارخانہ میں کاریگر عموماً چھوٹا اور نازک سا کپڑا باندھے رہتے ہیں اس لئے ایسے وقت جانا چاہئے جب وہ کپڑے پہنے ہوئے ہوں یا کارخانہ میں کام ختم ہو چکا ہو۔

کاغذ فروش پر لازم ہے کہ خریدار کو جس کام کے لئے کاغذ درکار ہے اسی مقصد کا کاغذ اس کو دینا چاہئے مثلاً نقل کرنے کے لئے نقل کے مطلب کا کاغذ دینا چاہئے اور حقیقت حال بھی بتا دینی چاہئے، کاغذ سازوں پر ایسے کاغذوں کو جن پر شرعی امور تحریر ہوں احترام لازم ہے، انھیں پیروں تلے نہیں روندنا چاہئے، اور جن پر شرعی امور تحریر نہ ہوں انھیں از سر نو درست کرنے کی اجازت ہے[1]۔

سامانِ کتابت، قلم، دوات اور سیاہی | قلم کے معنی سخت چیز کو کاٹنے کے ہیں، قلم سخت قسم کے نرکل کو تراش کر بنایا جاتا تھا، اس لئے اس کو قلم کہتے اور بعض تراشے ہوئے نرکل کو انبوبہ بولتے ہیں[2]، عہد عباسی میں قلم نرم سبک، تیز چلنے والا اور پائیدار پسند کیا جاتا تھا، سخت، ڈھیلا، دھیرے چلنے والا اور زیادہ گھسنے والا پسند نہیں کیا جاتا تھا[3]، قلمدان کو مقلمہ کہتے تھے[4]، بہترین قلم، جس قلم کے پوست کا رنگ صاف و سرخ ہوتا اور وزن دار، لمبا سیدھا اور اندر کا حصہ سفید ہوتا وہ قلموں میں سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا[5]، عہد عباسی میں قلم کی بڑی حفاظت کی جاتی تھی، اسے پیتل کے خول میں رکھا جاتا تھا[6]، واسطی کے قلم کا استعمال گرانی کے باعث وزرار و امرار تک محدود تھا، پھر گوند والی روشنائی روانی سے نہیں چلتی تھی، اس بنا پر خوشنویسوں نے اسکے

[1] المدخل لمحمد بن محمد العبدری القاسی امیر الحاج مصر مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۹۶۰ء، ج ۴ ص ۸۶-۸۸، [2] فرائد اللغۃ فی الفروق، مصر یکوس لامنس، بیروت، المطبعۃ الکاثولیکیہ از آبار الیسوعین سنہ ۱۸۸۹ء المفردات فی غریب القرآن للراغب ص ۱۰۴، القاموس تفسیر وزیر آبادی ج ۴ ص ۲۹۴، ۲۹۵ (قلم) [3] ادب الاملاء والاستملاء للسمعانی تحقیق میکس ویسو یلر لیڈن مطبعہ بریل سنہ ۱۹۵۲ء ص ۱۵۸ و ۱۶۳، ادب الکتاب للصولی تحقیق محمد بہجۃ الاثری بغداد المکتبۃ السلفیہ ۱۳۴۱ھ جلد ۲ ص ۹۵، [4] ایضاً، [5] رسالۃ خط از رضی الدین قزوینی، ص ۵۷، العمدہ لعبد اللہ بن علی الہیتمی تحقیق ہلال ناجی بغداد مطبعۃ المعارف ۱۹۷۰ء ص ۸-۹، تحفۃ اولی الالباب فی صناعۃ الخط والکتاب تالیف عبد الرحمن بن یوسف الصائغ تحقیق ہلال ناجی تونس دار بوسلامہ للنشر والتوزیع سنہ ۱۹۶۷ء ص ۵۴، ۵۷، [6] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۸۱

استعمال سے گریز کیا، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں نے اس کو بڑی ترقی دی، نامور ادیب وشاعر زعیم الدولۃ ابو العلاء صاعد بن الحسن نزیل دمشق المتوفی ۴۷۵ھ/۱۰۸۲ء نے ایسا قلم بنایا تھا جس میں ایک ماہ کی سیاہی سماتی تھی، اس کا نام القلم المداد رکھا تھا، یہ لوہے کا قلم تھا، اور ایک ماہ تک خشک نہیں ہوتا تھا[۵۱]

عہد عباسی میں سیاہی کے لئے تین لفظ نقس، مداد، حبر استعمال کئے جاتے تھے[۵۲]، نقس مطلق سیال مادہ جس سے لکھا جائے، مداد سیاہی کے ذریعہ حروف کو پھیلایا اور کھینچا جاتا ہے، اس لئے اس کو مداد کہتے تھے پھر اس کا استعمال دوات کی سیاہی کے لئے مخصوص ہوگیا تھا[۵۳]، یہ کاجل وغیرہ سے تیار کی جاتی تھی[۵۴]، چنانچہ نرم و سیاہ تر روان سیاہی کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا[۵۵]، حبر کے اصل معنی خالص رنگ کے ہیں اس لئے رنگ دار (سرخ وغیرہ) سیاہی کو حبر کہا جاتا تھا، وزیر حسن بن سہل کا قول ہے کہ جب کوئی فصیح و بلیغ آدمی اپنے الفاظ کو اچھی صورت میں پیش کرتا اور اپنے بیان کو حسن کلام سے آراستہ کرنا چاہتا ہے تو حکمت سے معمور معانی کا اس کے سامنے ہجوم ہو جاتا ہے جو کپڑے کی آرائش اور ان پر بیل بوٹے سے زیادہ پر رونق ہوتا ہے[۵۶]، عالم بھی کلام کو آراستہ کرکے پیش کرتا ہے اس لئے اس کو بھی حبر کہتے ہیں، حبر بحر کا مقلوب ہے، بحر اور سمندر منبع آب ہیں، عالم بھی علم کا منبع ہوتا ہے، علم پانی کی طرح ہے، پانی مادی حیات کا، علم ابدی وروحانی حیات کا سبب ہے، اس لئے جو علمی کارناموں کی وجہ سے زندہ رہتا ہے وہ کبھی مرتا نہیں ہے[۵۷] اسی لئے کہا جاتا تھا

---

۵۱ تاریخ الکبیر لابن عساکر بترتیب تہذیب عبد القادر آفندی بدران، دمشق طبعہ روضۃ الشام ۱۳۵۱ھ، ج ۶ ص ۳۶،

۵۲ ادب الکتاب للصولی، ج ۲ ص ۱۰۱، ۵۳ ایضاً، ۵۴ صبح الاعشیٰ، ج ۲ ص ۴۷۰ و ۴۷۵، لغت نامہ دہخدا، شمارہ مسلسل ۴۴ و شمارہ حرف ح، ج ۳ ص ۲۰۳، ۵۵ ایضاً، ۵۶ ادب الکتاب للصولی، ج ۲ ص ۶۵، ادب الاملاء للسمعانی ص ۱۶۳،

۵۷ جامع العلوم الملقب بدستور العلماء تالیف عبد النبی احمد نگری حیدرآباد الدکن، مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیہ، ۱۳۲۹ھ، ج ۲ ص ۹،

انما المجالس لاصحاب　　مجالس پھٹے پرانے کپڑے پہننے والوں
الخلقان والمحابر[۵۱]　　(صوفیہ) اور دواتوں سے لکھنے والوں
　　(محدثین و علماء) کی ہوتی ہیں،

ان کو حیات جاوید ملتی ہے، حبر اور مداد کے فرق کو ابن الندیم نے بھی ملحوظ رکھا ہے، حبر اور مداد سے لکھنے والوں میں امتیاز کیا ہے[۵۲]، عہد عباسی میں کتابوں میں ایسی پختہ سیاہی استعمال کی جاتی تھی کہ کپڑوں پر اس کے دھبوں کو ترشی سے دور کیا جاتا تھا[۵۳]، ان باتوں کا لحاظ انتخاب کتب میں بھی رکھا جاتا تھا، قلم اور سیاہی کو دیکھا جاتا تھا، یہ کتابوں کی قیمت پر اثر انداز ہوتی تھیں، اس لئے اس کا تذکرہ کیا جاتا تھا، عربی میں دوات کو محبرہ[۵۴] اور دوات رکھنے کے برتن کو دستیج کہا جاتا ہے[۵۵]، علوم وکتب میں اضافہ کی خاطر بعض علماء جب گھر سے نکلتے تو دوات وقلمدان اور کاپی اپنی پنڈلی میں جوتے کے ساتھ باندھ کر نکلتے تھے[۵۶]، عہد عباسی میں اشاعت کتب کا اندازہ بھی محبرہ کے شمار سے کیا جاتا تھا، مجلس املاء میں طلبہ اور نسخوں کی تعداد کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ محبرہ کی گنتی تھی، انھیں گن کر صحیح تعداد معلوم کی جاتی تھی[۵۷]،

عہد عباسی میں سیاہی سازی ایک فن کی حیثیت سے ممتاز تھی، سیاہی ساز اور سیاہی فروش کو حبری[۵۸]، اور حبار کہا جاتا تھا[۵۹]، عہد عباسی میں بعض اہل علم اپنی زمین وجائداد فروخت کرکے اس کی قیمت سے طلبہ کی سیاہی

---

۵۱ الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ لعبد القادر التمیمی تحقیق عبد الفتاح محمد الحلو القاہرہ: المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ ۱۳۹۵ھ، ج ۱ ص ۳۴۷، ۵۲ الفہرست لابن الندیم، ص ۱۲، ۵۳ ادب الاملاء للسمعانی، ص ۱۵۱، ۵۴ معجم الادباء، ج ۳، ص ۱۳۶، ۵۵ قضاء الادب عن ذکر علماء النحو والادب از ذوالفقار علی نقوی، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۳۱۶ھ ص ۳۹، ۵۶ الانساب للسمعانی، ورق ۵۸۰ ب، ۵۷ تاریخ بغداد، ج ، ص ۳۵۳، ۵۸ ایضاً، کتاب الانساب للسمعانی، ج ۴، ص ۴۴، اللباب لابن الاثیر ج ۱، ص ۳۳۶، تبصیر المنتبہ بتحریر المشتبہ لابن حجر تحقیق علی محمد البجاوی، مصر الدار المصریہ للتالیف والترجمہ، ۱۳۸۲ھ، ج ۱، ص ۳۹۳ و ۳۶۴ و ۳۹۵، ۵۹ کتاب الانساب، ج ۴ ص ۲۶، اللباب، ج ۱، ص ۳۳۴،

اور دوات وغیرہ کی ضروریات پوری کرتے تھے،[1]

کتابت وخوشنویسی زبان وبیان اور کتابت وتحریر اللہ تعالیٰ کا بنی نوع انسان پر خاص فیضان ہے، اس لیے قرآن نے اس کا ذکر بطور امتنان کیا ہے، فرمایا گیا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (الرحمن - ۲) اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" العلق - ۳ - ۵) اس (رحمٰن) نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا،

اس فضیلت وشرف میں جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا، لفظ وخط میں بھی ایک نوع کا شرف آگیا ہے، خط کے ذریعہ نوع انسانی کا خاصہ قوت سے فعل کی طرف آیا،[2] اور عقل ونطق اور خط کی وجہ سے انسان کو حیوانات پر فضیلت حاصل ہوئی ہے،[3] خط والفاظ برابر معانی پر دلالت کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ لفظ متحرک ہے، وہ بنی نوع انسان میں ایک گونہ حرکت پیدا کرتا ہے، خط ساکن ہے، یہ ذوق جمال کی تسکین کا موجب ہے،[4]

قرآن کی پہلی وحی "اقراء" پڑھ، اور سورہ القلم ن والقلم وما یسطرون (نون اور قسم ہے قلم کی اور جو وہ لکھتے ہیں) رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "اکتب"[5] "لکھو" اکتبوا ذالک لاحرج[6] (میری باتیں) لکھو کوئی حرج نہیں، قیدوا العلم

---

[1] تذکرة الحفاظ، ج ۳، ص ۹۸۶، ۹ ۴ ۲ ھ [2] ارشاد القاصد الی اسنی المقاصد تالیف محمد بن ابراہیم بن سعد مصر، مطبعة الموسوعات، ۱۳۱۸ھ ص ۳۰، [3] روح المعانی للآلوسی، ج ۱۵، ص ۱۱۱، [4] تحفة اولی الالباب للصائغ، ص ۲۶ - ۲۷، [5] سنن الدارمی تالیف عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی، دمشق، مطبعة الاعتدال ۱۳۴۹ھ ج ۱ ص ۱۲۵، المستدرک علی الصحیحین للحاکم، الریاض، مکتبة النصر الحدیث، ب، ت، ج ۱ ص ۱۰۵ - ۱۰۶، جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر ج ۱ ص ۷۱، تقیید العلم، ص ۷۴، تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبة، ص ۳۶۵، الالماع للقاضی عیاض ص ۴۶، فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۵، [6] المحدث الفاصل بین الراوی والواعی تالیف الحسن بن عبدالرحمٰن الرامہرمزی تحقیق محمد عجاج الخطیب بیروت، دار الفکر، ۱۳۹۱ھ، ص ۳۶۹ (حدیث نمبر ۳۳۱) تقیید العلم للخطیب، ص ۳۶۹، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد تجرید الحافظین العراقی وابن حجر تالیف نورالدین علی بن ابی بکر، القاہرة مکتبة القدسی ۱۳۵۳ھ ج ۱ ص ۱۵۱، منتخب کنز العمال للعلی المتقی، ج ۲، ص ۵۸، ....

....

بالکتاب[1] علم کو قید تحریر میں لاؤ، نے عربوں کے فکر ونظر کو بدلا، آپ کی پسندیدگی اور تاکیدی امر نے انھیں قرات وکتابت کا خوگر بنایا، اس سے عربی رسم خط کی خوب نشر واشاعت ہوئی، آپ نے وحی الٰہی کو عربی رسم خط میں قلمبند کرایا، صلح نامے، امان نامے، جاگیر نامے، معاہدے، بادشاہوں، امیروں کے نام سیاسی، تاریخی، مذہبی، تبلیغی خطوط، حکام وعمال کے نام فرامین سب اسی خط میں تحریر کرائے، معلم کے لئے بھی کاتب کا لفظ استعمال کیا،[2] سب سے پہلے سرکاری حیثیت میں عربی رسم الخط کا پہلا مدرسہ مدینہ میں مسجد نبوی میں قائم کیا،[3] اس میں نوشت وخواند کی تعلیم پر کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا، ہر ایک کو اس فن کی مفت تعلیم دی جاتی تھی، اس سے عربوں میں خصوصاً اور غیر عربوں میں عموماً عربی رسم خط کی نشر واشاعت ہوئی، بدر کے جنگی قیدیوں کا فدیہ دس مدنی بچوں کو کتابت سکھانا مقرر کر کے سرکاری حیثیت سے اس کی ترویج واشاعت کی اور ۲ ھ کے بعد مدینہ میں کتابت کے فن کی ایسی اشاعت ہوئی کہ پھر صحابہ رضؓ کی غالب اکثریت نوشت وخواند سے بہرہ ور ہوئی، ان میں کاتبان قرآن، مراسلہ نگار اور کاتب پیدا ہوئے، خط وکتابت کی ترقی، معاشرتی زندگی میں اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ جو تیر اندازی، شناوری کے ساتھ لکھنا پڑھنا جانتا اسی کو مرد کامل کہا جاتا تھا اس کے بغیر مرد ناقص سمجھا جاتا تھا،[4]

عہد رسالت میں سب سے زیادہ قرآن وحدیث کو لکھا جاتا تھا، کثرت کتابت کی وجہ سے کوئی رسم خط سے پہلے مدینہ

---

[1] المحدث الفاصل ص ۳۶۵ (حدیث نمبر ۳۱۸ و ۳۲۰) تاریخ بغداد للخطیب ج ۱۰ ص ۴۶ (له) تقیید العلم ص ۶۹، منتخب کنز العمال، ج ۴ ص ۶۹ الفتح الکبیر فی ضم الزیادة الی الجامع الصغیر تالیف یوسف النبہانی، مصر، مصطفی البابی الحلبی ۱۳۵۱ھ، ج ۲ ص ۳۰۶، [2] لسان العرب لابن منظور، ج ۲ ص ۱۹۳ (مادہ کتب) [3] سنن ابی داؤد، ج ۲، ص ۱۲۹، انتشار الخط العربی فی العالم الشرقی والغربی تالیف عبدالفتاح عبادہ، مصر، مطبعة ہندیہ ۱۹۱۵ء، ص ۱۲، [4] الفہرست لابن الندیم ص ۹ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم خط سریانی رسم خط کے انداز پر ترقی کرتے رہے، چنانچہ سریانی رسم خط میں ایک قسم التحریر المخفف تھی، جسے لیٹا خط مدور کہتے تھے، الفہرست لابن الندیم ص ۱۸

ومکہ میں عربی رسم خط کو فروغ حاصل ہوا، مدنی اور کی خط میں امتیازِ شان کی وجہ سے مدینہ کا رسم خط مدنی اور مکہ کا کی رسم خط کہلایا، پھر اس کے دائرۂ اثر میں وسعت ہوئی اور بصری، کوفی کی نسبت سے بھی مشہور ہوا۔

قرآن مجید کا رسم الخط ان تینوں خطوں سے جدا تھا، اسے الجزم کہتے تھے، جزم کے معنی کاٹنا ہیں، یہ خط حمیری (مسندی) سے ماخوذ ہے (کاٹ کر بنایا گیا) نقطے اور اعراب سے خالی تھا اس لئے اس کا نام جزم رکھا گیا تھا[۵۱] اسی خط میں مصاحف عثمانی لکھے گئے تھے اور عہد عثمانی میں ان کی نقلیں مختلف مرکزی شہروں کو بھیجی گئی تھیں،

اس سے عربی رسم الخط کو سرکاری حیثیت میں فروغ حاصل ہوا، صحابہ وتابعین نے اسی طرز تحریر میں اس کو نقل کیا، یہ رسم خط پورے اسلامی قلمرو میں پھلا پھولا۔

قرآن مجید قرأت، کتابت، تجلید ہر چیز میں دوسری کتابوں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس کے اصولِ قرأت جدا، اصول کتابت جدا ہیں، یہ مروجہ اصولِ کتابت کی پابندیوں سے بالاتر ہے، اس کے اصولِ کتابت پر قرار نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، ان ہی وجوہ سے ابن درستویہ المتوفی ۳۴۷ھ نے کتاب الکتاب میں تصریح کی ہے کہ صحف کے رسم الخط میں بعض باتیں اصولِ ہجا کے سراسر خلاف ہیں اُسے ہجا پر قیاس کرنا درست نہیں اور نہ اس کے رسم خط کی مخالفت درست ہے، کیونکہ جو کچھ مصحف میں مسطور ہے اس کو امت نے قبول کیا ہے[۵۲]، قرآنی رسم خط کوفہ میں کوفی علماء کا اور بصرہ میں بصری علماء کا مرکز توجہ بنا اور انھوں نے اسی رسم خط کی روشنی میں اصولِ کتابت وضع کئے تھے[۵۳]

(باقی)

---

[۵۱] مناہل العرفان فی علوم القرآن للزرقانی، ج ۱، ص ۳۵۶، [۵۲] کتاب الکتاب تالیف عبداللہ بن درستویہ تحقیق ویوس شیخو بیروت: المطبعۃ الکاثولیکیۃ، ۱۹۲۷ء، ص ۷، مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ تالیف احمد طاش کبری زادہ، تحقیق کامل بکری، عبدالوہاب ابوالنور، القاہرہ، دار الکتب الحدیثہ، ۱۹۶۸ء، ج ۱ ص ۹۴، [۵۳] الہدایہ الی ضوابط الکتابۃ تالیف ابراہیم عبداللطیف القاہرہ، شرکۃ مرکز کتب الشرق الاوسط، ۱۹۷۲ء، ص ۱۱ و ۱۲،

اشعار وقصائد کی دینی حیثیت

از
مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری

(۳)

مولانا ثناء اللہؒ اور شعری واقفیت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ کو شعر فہمی کا بہت اچھا ذوق تھا، آپ اپنی تصنیفات ومضامین میں موقع ومحل کے لحاظ سے سعدی وغالب وحالی وغیرہ جیسے شعراء کے اشعار بے تکلف استعمال کرتے تھے، اس موقع پر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ایک شعری لطیفہ دہلی میں مولانا امرتسریؒ کا ایک مشہور آریہ سے مباحثہ ہو رہا تھا، اس نے کہا کہ شیطان وغیرہ کا سارا قصہ فضول ہے، اگر شیطان ہو تو بتلائیے کہ اس کی صورت کیسی تھی؟ حضرت مولانا امرتسری مرحوم نے اس کے جواب میں بس ایک شعر پڑھا جس سے جلسہ کا رنگ بدل گیا اور فتح وکامیابی سے ہمکنار ہوئے، معترض آریہ کو مخاطب کیا اور یہ شعر پڑھ کر اسے سنایا:

رات شیطاں کو خواب میں دیکھا ساری صورت جناب کی سی تھی

لیجئے مولانا نے شیطان کا حلیہ بیان فرما دیا، اور اس سوال کا ترکی بہ ترکی جواب بھی ہوگیا، اگر یہی مضمون نثر میں پیش ہوتا تو اس لطافت سے خالی ہوتا، قادیانی، مولانا امرتسری مرحوم کی موت کے انتظار میں بے چین ہوکر جب کچھ لکھتے تو مولانا غالب کا یہ شعر پیش کر دیتے:

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کیوں جیتا ہے غالبؔ قسمت میں ہے اعداء کا جلانا کوئی دن اور

ایک بار مولانا امرتسری مرحوم بنارس تشریف لائے، سارے شہر میں آپکے وعظ کا اعلان ہوا، اس زمانہ میں ہم بنارس تعلیم حاصل کر رہے تھے، ہم بھی جلسہ میں شریک تھے، بنارس کے گاؤں میں حضرت مولانا صاحب تقریر کر رہے تھے کہ کوئی مناظرہ کی بات آئی، ایک آریہ مناظر نے

کہا کہ ہم بڑے آدمی سے کیا مناظرہ کریں، تو مولانا نے برجستہ شیخ سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا،

برائے جہاں دیدگاں کار کن — کہ صید آزمودہست گرگ کہن

(بوستاں)

یعنی بوڑھا آدمی تجربہ کار ہوتا ہے، جس طرح پرانا بھیڑیا شکار میں ماہر ہوتا ہے،

حضرت مولانا علی میاں صاحب کی شعری واقفیت

اس بیسوی صدی میں علم و فضل میں ممتاز، تقریر و تحریر کے شہسوار، عرب و عجم کے خطیب شہیر، ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں صاحب ندوی، اردو، عربی، فارسی، اشعار کے معدن و مخزن ہیں، بے شمار اشعار آپ کو حفظ ہیں، اور اپنی مؤلفات و مصنفات میں اور اپنے خطبات و تقریروں میں برمحل اور موزوں اشعار کو اس طرح فٹ کرتے ہیں کہ پورے مضمون کی ایک شعر میں ترجمانی ہو جاتی ہے، دو تین واقعات ملاحظہ ہوں،

(۱) ایک زمانہ میں ندوۃ العلماء کے طلبہ نے کچھ شورش پسندوں کی تحریک پر اسٹرائک کی، دار العلوم کے مہتمم کا گھراؤ کیا، کچھ باغیانہ مطالبات رکھے، مولانا علی میاں نے منتظمہ کی میٹنگ میں صورت حال کا مکمل نقشہ رکھا، اور حسب دستور اپنے خیالات کو ایک مقالہ کی شکل میں پیش فرمایا، اس مقالہ کے آخری صفحات میں طلبہ کی اصلاح حال کے جذبہ کے تحت چند بندشوں اور قیود پر ارباب انتظام کو سختی سے کاربند رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے ڈاکٹر اقبال کے مندرجہ ذیل شعر پر اپنے مقالہ کو ختم فرمایا تھا:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے — اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

دیکھئے یہ شعر کس قدر برمحل ہے، مولانا کے ذوق لطیف و استحضار اشعار کی جس قدر بھی داد دیجئے کم ہے،

(۲) ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن از ۳۱ر اکتوبر تا ۳ر نومبر ۱۹۷۵ء کو منعقد کیا گیا، اس میں حضرت مولانا نے خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا، اس میں ایک موقع پر لکھا تھا کہ ہم کو اپنے مقاصد عزیز ہیں، ہم اسلام کے معاملہ میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لیے طیار نہیں ہیں، ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اسی اصول پر عمل پیرا ہونے کے سبب بہت سے ان منافع و مواقع سے آنکھیں بند کرنی پڑیں گی، جو ہوا کے رخ پر چلنے والے طبقوں اور فرقوں کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ ہمارا خدا اگر ہم سے راضی ہے اور ہم خلوص و صبر کے ساتھ اپنی حق پسندی پر قائم ہیں، تو ہمارے لیے کوئی تنگی اور ہماری قسمت میں کوئی محرومی نہ ہوگی، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ساری کائنات ارادہ الٰہی کے تابع ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، اس لیے ہم کو ذرا بھی پریشانی نہیں ہے، یہ سب لکھ کر ایک شعر لکھتے ہیں، جس میں پورے مضمون کو سمو دیا گیا ہے،

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے — نگاہ یار سلامت ہزار مے خانے

اب ذرا دیکھئے کہ مولانا نے کس قدر برمحل و موزوں شعر آخر میں لکھدیا، جو انگشتری میں نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے، اور سارے مضمون کا ترجمان ہے، فللّٰہ درہ،

(۳) ایک موقع پر مولانا سے شکوہ ہوا کہ مولانا علی میاں نے بہوگنا سے عرض حال کر کے اپنا مطلب نکال لیا، اور ندوہ کے لیے زمین حاصل کر لی، لیکن علیگڑھ پر کیا کیا ستم توڑا جا رہا ہے، اس جارحیت کے لیے ان کے دل میں ذرا بھی ٹیس نہیں اٹھتی، یہ شکوہ کرنے والے ایک دردمند ملت عالی دماغ ایک مشہور و معروف وکیل صاحب ہیں، جو جماعتی و ملی دینی کونسل کے مشترک کاموں کے سبب مولانا کے مخلصین و محبین میں شمار کیے جاتے ہیں، جب یہ شکوہ ان کی جانب منسوب ہو کر مولانا تک پہونچا تو حضرت مولانا نے برمحل یہ شعر پڑھا:

ان کان صنزلتی فی الحبّ عندکم — ما قد لقیت فقد ضیعت ایامی

اگر میری محبت کا مقام آپ کے نزدیک یہ ہے جس سے میں دوچار ہوا ہوں، تو میں نے اپنی عمر رفتہ کو آپ کے ساتھ رہ کر ضایع کر دیا،

کس قدر برمحل و برجستہ شعر ہے، نکتہ چین دوست کی آنکھیں کھل سکتی ہیں۔ مولانا کی تحریر میں ہمیشہ برمحل اشعار اس قدر آتے ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے،

موجودہ دور کے شعراء

مفکر ملت ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم اور لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کے اشعار میرے لیے تو غذائے روح کا درجہ رکھتے ہیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں، ہندوستان کی موجودہ صورت حال پر جگر مراد آبادی فرماتے ہیں:

اس نفع و ضرر کی دنیا میں یہ لیا ہے درسِ جنوں ہم نے   خود اپنا زیاں تسلیم مگر اوروں کا زیاں تسلیم نہیں
ارباب ستم کی خدمت میں اتنی ہی گذارش ہے میری   دنیا سے قیامت دور سہی دنیا کی قیامت دور نہیں

حضرت اکبر الہ آبادی انگریزی عہد کے حالات پر تنقید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں،

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے   ناز اتنا نہ کرے ہم کو مٹانے والے
قدم شوق بڑھے انکی طرف کیا اے اکبر   دل سے ملتے ہی نہیں یہ ہاتھ ملانیوالے

مسلمان دوسری قوموں سے صلح و محبت کا عہد و پیمان کر سکتے ہیں، مگر اپنی مستقل ہستی کو فنا نہیں کر سکتے، اکبر الہ آبادی اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی   لطف دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمھیں اہل حرم اس سے بچو   دیر والے کج ادا کہدیں یہ بدنامی بھلی

مشینی ایجادات و ترقیات سے مرعوب یورپ زدہ حضرات پر اکبر مرحوم نے جابجا تنقید کی ہے، تمثیلاً بھی نقل کیے جائیں، تو کافی صفحات خرچ ہو جائیں، سردست دو تین اشعار ملاحظہ ہوں، لکھتے ہیں:

ایرشپ پر چڑھے تو ایسا کہ ہم ہی ہم ہیں خدا نہیں ہے   ایرشپ پے کرے تو ایسا لاش تک کا پتہ نہیں ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں:

ذرا سائنس کے ان دیوتاؤں سے کبھی پوچھو   یہ مشت خاک کیونکر جان کے سانچے میں ڈھلتی ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں،

سائنس سے زیادہ ہے مذہب کی جڑ بڑی   توپوں کی مار سے بھی خدا کی پکڑ بڑی

ان کے ظریفانہ و طنزیہ اشعار بھی کثیر اور بے حد لطیف ہیں:

کہا آدم نے آدمی ہوں میں   ڈاروِن بولا بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے ایک دوست   فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

زائر حرم حمید صدیقی نے حرمین شریفین کے متعلق تمام پاک جذبات و لطیف احساسات کا جس طرح اظہار کیا ہے، وہ دفتر کے دفتر ہیں، اور سب کے سب کار آمد اور قابل قدر ہیں، دو شعر ملاحظہ ہوں:

قابل نظارہ ہے کعبہ کے پردہ کی بہار   ہر طرف سے جھومتی کالی گھٹا آنے لگی
بھینی بھینی پھر شمیم جاں فزا آنے لگی   ٹھنڈی ٹھنڈی پھر مدینے کی ہوا آنے لگی

ایک موقع پر نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

دربار نبی کے جلووں کی وہ بارش پیہم کیا کہیے   وہ صبح کا منظر کیا کہیے وہ شام کا عالم کیا کہیے
وہ جنت روح و خلد نظر وہ سوز و گداز قلب و جگر   کیا کہیے گا آرام گہ سرکار دو عالم کیا کہیے

ڈاکٹر اقبال کے حکیمانہ اشعار

حکیم ملت کے تمام اشعار گراں قیمت ہیں، ان میں انتخاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں، وہ قرآن حکیم کے متعلق لکھتے ہیں:

زشام ما برون آور سحر را — ز قرآں باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرأت تو — دگر گوں کرد تقدیر عمر را

خدا کی توحید فی العبادت سے متعلق لکھتے ہیں:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اختیار کرنے سے متعلق لکھتے ہیں:

در جہاں زی چوں رسولِ انس و جاں — تا چوں او باشی قبول انس و جاں

دین و دنیا کے تعلق پر ایک جگہ انتباہ کرتے ہیں:

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت — ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

دین اسلام کی ہمہ گیری اور وحدت ملی پر لکھتے ہیں:

دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم — زیں جہت با یکدگر پیوستہ ایم
ہست دین مصطفیٰ دین حیات — شرع او تفسیر آئینِ حیات

تقدیر اور تعمیل احکام الٰہیہ کی گتھی کو اس طرح سلجھاتے ہیں:

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام — یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خرد مند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

دین سے بیگانہ کرنے والی تعلیم و تہذیب کے متعلق لکھتے ہیں:

ہم نے سمجھا تھا کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اس سے بھی واضح طور پر ایک جگہ لکھتے ہیں:

بایں مکتب بایں دانش چہ نازی — کہ نان در کف نداد جاں زتن برد

ملت اسلام کے درد میں لکھتے ہیں:

ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق — ہسپانیہ پہ کیوں نہیں حق اہل عرب کا

جمہوریت کے موجودہ ووٹنگ سسٹم اور اس کے طریقۂ کار پر لکھتے ہیں:

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

نظام برتھ کنٹرول سے متعلق لکھتے ہیں:

دیدہ ہائے نم ز حبّ سیم و زر — مادراں را بار دوش آمد پسر
وائے بر قومے کہ از بیم ثمر — می بردنم راز اندامِ شجر

سرمایہ دارانہ تمدن سے متعلق لکھتے ہیں:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

سینما کی مضرّت پر لکھتے ہیں:

سینما ہے یا صنعتِ آذری ہے — وہی بت فروشی وہی بت گری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہد کہن کا — یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے

غنا و موسیقی کو فنون لطیفۂ غلامان کا لقب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

نغمۂ او خالی از نارِ حیات — ہمچوں سیل افتد بدیوارِ حیات
از نے او آشکارا رازِ او — مرگِ یک شہر است اندر سازِ او
ناتوان و زار می سازد ترا — از جہاں بیزار می سازد ترا
الحذر ایں نغمۂ موت است و بس — نیستی در کسوتِ صوت است و بس

اشعار کے ذریعہ اصلاح اخلاق اعمال

اشعار خواہ عربی کے ہوں یا فارسی کے، ہندی کے ہوں یا اردو کے، کسی زبان میں شعر گوئی کی جائے ان اشعار سے ملک و ملت کی علمی، ادبی، روحانی، اخلاقی خدمت ہی مدنظر ہونی چاہیے، قابل قدر اشعار وہی ہیں جن میں اصلاح اخلاق و اعمال اور عزم و عمل کے لیے انقلاب آمیز دعوت و تحریک پوشیدہ ہو، حکیم ملت ڈاکٹر اقبال اپنے شعروں کے اندر سوز و شعلہ افگنی کو جس قدر ضروری سمجھتے ہیں، اسکا اندازہ ان کے چند اشعار سے ناظرین کو ہو سکیگا، لکھتے ہیں:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اگر اشعار میں گرمی و تیزی نہ ہو اور شعور کو بیدار و ہوشیار نہ کرسکتے ہوں تو وہ شعر کی فہرست سے خارج کر دینے کے قابل ہیں وہ لکھتے ہیں:

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — نرا نفس ہے اگر نغمہ نہ ہو آتشناک
مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ — کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بے باک

وہ شعر کی تیزی و شعلہ ریزی سے متعلق لکھتے ہیں:

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر — کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی
عزیز تر ہے متاع امیر و سلطاں سے — وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز براقی

ایک جگہ شعر کے داعیانہ پہلو سے متعلق لکھتے ہیں:

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے — یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ سرافیل

واقعی اگر شعروں کی آتش افشانی کے ذریعہ قلب کے گداز اور جگر کے سوز کو صدق و اخلاق کے جوہر کے ساتھ عیاں کر دیا جائے، تو ایسے اشعار دلوں میں آگ لگا کر ان کے غلط جذبات، باطل

خیالات کو خاکستر بنا کر دل کو مجلی و مصفا کر کے ہم آہنگ عزم و عمل بنا سکتے ہیں، ایسے ہی اشعار کی قیمت ہمیشہ کی طرح آج بھی ہے، اور ملت اسلام کو ایسے پاکیزہ بیان شاعروں کی ضرورت آج بھی ہمیشہ سے زیادہ ہے، اقبال مرحوم کیا خوب لکھتے ہیں:

شعر را مقصود گر آدم گری است — شاعری ہم وارث پیغمبری است

اصغر گونڈوی مرحوم شعروں کے خواص و تاثیرات سے متعلق لکھتے ہیں:

اصغر غزل میں چاہیے وہ موج زندگی — جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

حالی بھی اپنی شاعری کی عظمت کے متعلق لکھتے ہیں:

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار — شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

انیس بھی اصناف شاعری پر اپنے عبور و دسترس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر — مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

شاد عظیم آبادی اپنے شاعرانہ کمال پر لکھتے ہیں:

شعر کہتے ہیں کسے بزم میں کھل جائیگا — شاد آیا نہ کہو حافظ شیراز آیا

اکبر الہ آبادی مرحوم لکھتے ہیں:

شعر غیروں کے انہیں مطلق نہیں آتے پسند — حضرت اکبر کو بالآخر طلب کرنا پڑا

بہرحال عرض مدعا یہ ہے کہ ایسے اشعار جن میں زندگی کا پیغام داعیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہو، اور جس میں گداز جگر اور نورانیت قلب کا سامان بالقصد بہم کیا گیا ہو، اور جن کے ذریعہ دلوں اور ارمانوں میں تحریک اور عمل انقلاب کی شورش اور سوزش پیدا کرنے کا نظم و اہتمام ہو، اور ہمت و عزم کی جولانیاں اور طوفان خیزیاں اس کا ایک نمایاں عنصر ہو، ایسے پاکیزہ و حکیمانہ اشعار اور ایسے محسنین اسلام و شعرائے کرام کی آج بھی ضرورت ہے، اقبال مرحوم بھی

اپنی شعلہ نوائی کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں،

بضمیرم آں چناں کن کہ زشعلۂ نوائے
دلِ خاکیاں فروزم دلِ نوریاں گدازم

(زبور عجم)

بے شک ایسے اشعار جو دردانگیز و دلگیر ہوں، ہر ذی شعور و صاحبِ احساس انسان کو پیارے ہوں گے، ہزاروں باذوق حضرات ڈاکٹر اقبال کے اشعار کے قدرداں اور اس کی زلف دراز کے حلقہ ہائے پیچاں کے آج تک اسیر ہیں، وہ شعروں کے متعلق خود لکھتے ہیں:

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

اقبال مرحوم نے زبور عجم میں اچھے اشعار کی نایابی کے متعلق ایک سچی بات لکھدی ہے، اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃً کے مصداقات آج عالم میں بہت کم پاؤ گے، یعنی شعرا تو آج بھی ہیں، مگر دانائے راز نہیں ملیں گے، میکدے تو نظر آئیں گے، مگر ان کے جام و مے میں حجازی خوشبو اور اسلامی رنگ و بو نہ ہوگی، چنانچہ لکھتے ہیں:

در من گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست
پیر مردے کہ مئے تند و جوانے دارد

الحاصل | اصلاحی و اخلاقی اشعار، علمی و ادبی منظومات و غزلیات جن سے کسی درجہ میں دین، علم، زبان، ادب کی خدمت ہو رہی ہو، ان سے استفادہ اور ان کا ذوق ہر زمانہ کے اہل علم کو رہا ہے، اور آج مزاج شرع کو ایسے لطیف اشعار کے ذوق سے کوئی انکار و تنافر نہیں ہے، خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر شعر و شاعری، ادب اور زبان کی واقفیت و مہارت دینی و تبلیغی مقاصد کے پیش نظر میرے نزدیک ایک صحیح دینی تقاضا کی خانہ پری اور ایک درجہ میں اسلامی خدمت ہے،

ان تمام معروضات و تفصیلات کے بعد بھی اشتباہ و خطا ہیں اگر مناسب و موزوں اشعار پڑھنے کو معیوب سمجھا جائے تو صاحب ذوق علمی مذاق کے رکھنے والے بزرگ کی روح کو مقالہ شعریہ سپرد کرکے رخصت ہوتا ہوں، میرے حسب حال اقبال نے کیا خوب لکھا ہے،

کس از من نگیں شناساں نگذشت برنگینم
بتو می سپارم او را کہ جہاں نظر ندارد

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

یہ مقالہ دار العلوم دیوبند کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی حکومتیں صدیوں رہیں، سندھ میں عربوں اور اور دوسرے مسلمان خاندانوں نے چھ سو برس تک حکومت کی، غزنوی شمالی ہند کے ایک بڑے حصہ پر تقریباً ڈیڑھ سو برس تک قابض رہے، ان کو غوریوں نے ختم کیا تو پھر سلاطین دہلی کی حکومت ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک رہی، اس کے بعد مغلوں کا اقتدار ۱۸۵۷ء تک قائم رہا، وقتاً فوقتاً مالوہ، گجرات، جونپور، خاندیش، دولت آباد، برار، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور بنگال میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، انھوں نے جہاں ان علاقوں میں سیاسی، زراعتی، صنعتی، معاشی اور تمدنی فروغ کے لئے ہر قسم کی کوششیں کیں، وہاں تعلیم کی ترویج کے لیے بڑے بڑے مدارس بھی قائم کئے، جید عالموں اور مدرسوں کو بلاکر درس و تدریس کا پورا انتظام کیا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں جو اہم مدارس قائم ہوئے، ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں، مگر

صرف دہلی میں جو شاندار مدارس قائم کئے گئے تھے، ان کی تھوڑی سی جھلکیاں اس اجتماع میں دکھانے
اجازت کا خواہاں ہوں، پہلے خلجیوں کے عہد کا ذکر سماعت فرمائیں، مولانا ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی
میں لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں یہاں کے جیسے علماء بخارا، سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، اصفہان،
رے اور روم میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں کہیں بھی نہ تھے، وہ منقولات، معقولات، تفسیر، فقہ،
اصول فقہ، معقولات، اصول دین، نحو، لغت، معانی، بدیع، بیان، کلام، منطق اور ہر قسم کے
علوم میں موشگافیاں کرتے تھے، ہر سال بہت سے طلبہ ان سے درس لے کر درس دینے اور
فتوے کے جوابات دینے کے مستحق ہوجاتے تھے، ان میں سے بعض تو علوم وفنون میں کمال حاصل کرکے
غزالی اور رازی کے مرتبے پر پہونچ گئے تھے" مولانا ضیاء الدین برنی نے ان میں سے
بہت سے علماء اور اساتذہ کے نام لکھ کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے
علمی کمالات لکھے جائیں، تو علحدہ علحدہ ایک کتاب ہوجائے، وہ یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ ان میں
سے ہر ایک اپنے عہد کا امام ابو یوسف قاضی اور امام محمد شیبانی تھا، وہ برابر درس دیتے رہتے تھے۔
کوئی مفتی یا مدرس اپنی استادی کی شان دکھلاتا ہوا خراسان، ماوراء النہر، خوارزم، یا کسی اور
شہر سے دہلی میں آجاتا اور یہاں کے ان اساتذہ کے کمالات دیکھتا تو ان کے سامنے
زانوئے ادب تہہ کرتا، اور اپنے علم کی کمی کو پورا کرتا، اگر ان اساتذہ کی زندگی میں کوئی
نئی تصنیف بخارا، سمرقند، خوارزم یا عراق سے اس شہر میں لاتا، اور یہاں کے اساتذہ اس کی
تعریف کردیتے تو وہ معتبر سمجھی جاتی، ورنہ بے کار خیال کی جاتی۔ (تاریخ فیروز شاہی ص ۵۴-۵۵)

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس وقت دہلی میں بڑے بڑے مدارس تھے، جن کے نام تو مولانا
ضیاء الدین برنی نے نہیں لکھے ہیں مگر تاریخوں میں مسجد قوت الاسلام مقبرہ علائی اور حوض خاص کے
مدرسوں کا ذکر آتا ہے، ظاہر ہے کہ خلجیوں کے عہد میں ان مدرسوں ہی میں دینی تعلیم ہوتی رہی ہوگی،

مولانا ضیاء الدین برنی نے فیروز شاہ تغلق کے عہد کے مدرسہ فیروز شاہی کا ذکر کیا ہے تو اس کی خوبیاں
بیان کرنے میں ان کا قلم بے قابو ہوگیا ہے، ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں، پہلے اس کی جائے وقوع اور
عمارت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"مدرسۂ فیروز شاہی کی عمارت حوض علائی کے کنارے تعمیر کی گئی ہے، اپنے گنبدوں
کی بلندی، تعمیرات کی خوبی، صحنوں کے تناسب، نشست گاہوں کی لطافت، اپنے روزانہ
استعمال کے کمروں، اور ستونوں کی دل آویز قطاروں کی وجہ سے دنیا کی مشہور عمارتوں
سے بھی سبقت لے گئی ہے۔"

اس عمارت کو دیکھ کر اس زمانے کے لوگوں اور مسافروں پر جو اثر پڑتا تھا، اس کی مرقع
آرائی کرنے میں ضیاء الدین برنی کا قلم رقص کرنے لگا ہے۔

"یہ عمارت ایسی عجیب وغریب ہے کہ یہاں کے رہنے والے اور باہر سے آنے
والے مسافروں میں جو بھی یہاں پہونچ جاتا ہے، وہ تصور کرتا ہے کہ وہ بہشت عدن
میں آگیا ہے، یا فردوس میں جگہ پاگیا ہے، یہاں داخل ہوتے ہی اس کا حزن وملال
جاتا رہتا ہے، اس کو دیکھ کر مغموم دل کھل جاتے ہیں، اس کے روح افزا نظارہ سے
خستہ روحوں میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہوجاتی ہے، اور لوگ اپنے پرانے غم کو
بھول جاتے ہیں، اس عمارت کو دیکھ کر اس کے ایسے شیفتہ اور دلدادہ ہوجاتے
ہیں کہ ان کو اپنے گھروں کی یاد نہیں آتی، وہ اپنے کام کو بھول جاتے ہیں، اور
اس مدرسہ سے باہر آنکلنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا ہے۔"

مولانا ضیاء الدین برنی کا یہ بھی بیان ہے کہ لوگ اس مدرسہ کے ایسے دلدادہ ہوگئے تھے،
کہ اپنی پرانی رہائش گاہوں کو چھوڑ کر اس کے اردگرد آباد ہونے لگے تھے، اور روزانہ دس پندرہ بار

اس کے اندر آکر سیر کرتے تو بھی ان کی تشفی نہیں ہوتی، اس کو دیکھ کر باہر کے سیاحوں کے جو تاثرات ہوتے، ان کو اس طرح قلمبند کرتے ہیں۔

"باہر کے مسافر اس کی ہوا کی خوبی کی وجہ سے اسی جگہ قیام پذیر ہو گئے ہیں اور اپنے سفر کے مقصد اور ضرورت کو بھول گئے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بقیہ عمر یہیں گذرے، اطراف عالم سے جو بھی یہاں آتا ہے، اس کی عجیب و غریب عمارت اور یہاں کی لطیف ہوا سے متاثر ہوتا ہے، اور شدید قسمیں کھا کر کہتا ہے کہ اس نے دنیا کے بہت سے حصوں کا سفر کیا ہے، اور بہت سے شہر دیکھے ہیں لیکن مدرسہ فیروزشاہی جیسی خوبصورت عمارت اور اس کی جیسی روح افزا ہوا کہیں نہیں پائی، یہ اپنی خوبی اور حسن تناسب کے لحاظ سے ایسی نادر ہے کہ خورنق نے بابل میں جو عمارت بنائی یا کسریٰ نے جو محل بنوایا، ان پر اپنی برتری کا دعوی کرے تو جائز ہوگا۔"

پھر مدرسہ کی معنوی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے، مولانا ضیاء الدین برنی رقمطراز ہیں کہ یہ خیرات وحسنات کا منبع ہے، اس میں لازمی و متعدی دونوں قسم کی عبادتیں کی جاتی ہیں، پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا ہوتی ہے، ان کے علاوہ صوفیہ، چاشت، اشراق، زوال، اوابین اور تہجد کی نمازیں پڑھتے رہتے ہیں، اور شب و روز یہیں اپنا وقت گذارنا پسند کرتے ہیں، یہیں نہایت قابل استاد مولانا جلال الدین رومی دینی علوم کا درس دیتے رہتے ہیں، تفسیر، حدیث اور فقہ کی بھی تعلیم دیتے ہیں، حفاظ ختم قرآن کرنے میں مصروف رہتے ہیں، موذن جب اذان دیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آواز آسمان تک پہونچ رہی ہے، طلبہ کے لیے وظائف اور انعامات مقرر ہیں، ان کے دستر خوان نعمتوں سے بھرے رہتے ہیں، یہاں جو بھی ہوتا ہے۔

چاہے عبادت کرنے والے ہوں یا طلبہ یا حفاظ، یا اصلی یا ذاکر یا باہر سے آکر یہاں مقیم ہوں سب کی راحت اور آسائش کا سامان کیا جاتا ہے، یہ سب کچھ لکھ کر مولانا ضیاء الدین برنی ایک بار پھر مدرسہ کی عمارت کی تعریف یہ لکھ کر کرتے ہیں کہ شداد بن عاد نے باغ ارم تعمیر کیا تھا لیکن اس منحوس عمارت سے کسی کو فائدہ نہیں پہونچا، مگر اس مدرسہ کی عمارت کو اس سے برتری حاصل ہے، یہ عالموں صالحوں اور عابدوں کی معدن و منبع بنی ہوئی ہے، دلی میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں، ان میں بے حساب روپئے خرچ کیے گیے لیکن اب وہ دیوؤں اور پریوں کا مسکن بنی ہوئی ہیں، اس کے مقابلہ میں مدرسہ فیروزشاہی کی عمارت میں جو خوبصورتی، فرحت اور راحت موجود ہے، وہ کسی اور میں نہیں (تاریخ فیروزشاہی، صفحہ ۵۶۵ - ۵۶۲)

فیروزشاہ نے ایک دوسرا مدرسہ بالابند سیری میں قائم کیا تھا، جس کی عالی شان اور خوبصورت عمارت مدرسہ فیروزشاہی ہی کی طرح تھی، یہ مدرسہ قصر معلوم ہوتا تھا، اس میں بہشت کے سے باغ اور سبزہ زار نظر آتے، اس کے نگراں اور مدرس مولانا سید الائمۃ العلی نجم الملت والدین سمرقندی تھے، ان کے لئے گاؤں، وظیفہ اور انعام مقرر تھے۔ بہت سے طلبہ کو نان اور خوراک وظیفے کے طور پر دی جاتی تھی، جو روزانہ دینی علوم کے درس لیتے (تاریخ فیروزشاہی صفحہ ۶۶ - ۵۶۵)، فیروزشاہ نے اپنے لڑکے شہزادہ فتح خان کے مقبرہ کے ساتھ بھی ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا، جس کے اخراجات حکومت کی طرف سے برداشت کئے جاتے، ان کے علاوہ اس عہد میں ۳۰ اور مدرسے قائم کئے گئے۔ (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۵۱)

ہمایوں نے دہلی میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے، پھر ہمایوں کے مقبرہ کے اوپر بھی ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ مقبرہ کے پہلو کے چھوٹے چھوٹے کمروں میں طلبہ رہا کرتے تھے، عہد اکبری میں اکبر کی مرضعہ ماہم بیگم نے پرانے قلعہ کے مغربی دروازہ کے

سامنے ایک مسجد اور ایک مدرسہ بھی بنوایا، جس کا نام خیر المنازل تھا، شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے دہلی کے جس مدرسہ میں تعلیم پائی، اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا، دہلی کی شاہجہانی مسجد کے جنوبی رخ پر بھی ایک شاہی مدرسہ تھا جس کا نام دار البقا تھا، شاہ عبد الرحیمؒ نے دہلی میں جو مدرسہ قائم کیا، اس میں شاہ ولی اللہؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، شاہ عبد العزیز دہلویؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، شاہ اسحٰق اور شاہ عبد القادرؒ جیسے جید اور نادرہ روزگار علما نے تعلیم پائی، اور باری باری اسکے مسند درس و تدریس پر متمکن ہوئے۔

بہادر شاہ اول کے عہد میں غازی الدین خاں فیروز جنگ نے اجمیری دروازہ کے پاس ایک مدرسہ قائم کیا، لکھنو کے نواب اعتماد الدولہ فضل علی خان نے اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے ایک لاکھ ستر ہزار روپے دیئے تھے، محمد شاہ کے عہد میں نواب شرف الدولہ ارادت خاں نے بھی ۱۱۳۵ھ میں یہاں ایک مدرسہ قائم کیا، (مزید دیکھو ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ، صفحہ ۲۷-۲۰)

افسوس ہے کہ دہلی کے ان تاریخی مدارس کے نام و نشان تک مٹ گئے ہیں، محکمہ آثار قدیمہ کے ماہروں کو ان کے کھنڈرات بھی کہیں مشکل ہی سے ملیں گے،

جس مدرسہ سے قاضی ابو یوسف اور امام شیبانی کے پایہ کے بزرگ پیدا ہوئے یا جس مدرسہ کی عمارت باغ ارم اور قصرِ کسریٰ سے برتر تھی، یا جس مدرسہ سے تعلیم پاکر شیخ عبد الحق دہلویؒ جیسے محدث نے ہندوستان میں حدیث کی قندیلیں روشن کیں یا جس مدرسہ میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیزؒ اور شاہ اسمٰعیل نے تعلیم پاکر دینی علوم کا سونا پگھلایا اور اپنی تحریروں کی حکمت بیزیوں سے ہندوستان کے اسلامی ماحول کو معطر معطر کیا، ان کو تو اپنی ملت سینوں سے لگائے رکھتی، مگر ان کے نام و نشان مٹ گئے، آخر کیوں ؟

صوفیائے کرام کے مقبروں اور خانقاہوں کی عمارتیں جب سے تعمیر ہوئیں، اب تک قائم ہیں، حالانکہ ایک بڑے طبقہ کا یہ الزام ہے، کہ ان ہی سے بدعتیں پھیلیں، مگر جن مدرسوں سے توحید، رسالت، ارکان اربعہ اور ایمان کے سرچشمے بہتے رہے، وہ کیوں ختم ہو گئے ؟ ہمارے پاس اس وقت کوئی ایسا مدرسہ نہیں جس کی تاریخ صدیوں کی ہو، یہ عجیب المیہ ہے، کہ جب مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت اور حکومت ہندوستان میں ختم ہوئی، تو انتہائی بے سروسامانی اور حکومت کی سرپرستی کے بغیر جو مدرسے قائم ہوئے، ان کے تو صد سالہ جشن دھوم دھام کے ساتھ منائے جا رہے ہیں، مگر جب حکومت کی سرپرستی حاصل رہی اور مدرسوں کے لیے بہشت کے نمونے کی عمارتیں تعمیر ہوئیں، ان کے لیے جاگیریں بھی وقف ہوئیں، ان کے اساتذہ خاطر خواہ تنخواہیں بھی پاتے رہے، اور ان کے طلبہ کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا بہتر سے بہتر انتظام تھا، وہ آج نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئے ہیں، یورپ کی بعض تعلیم گاہوں کی تاریخ صدیوں سے چلی آ رہی ہے، مگر ہمارے پاس ایک بھی ایسا مدرسہ نہیں جس کی بقاء کی میعاد صدیوں تک رہی ہو، آخر کیوں ؟

اس کا جواب اگر جذباتی اور تاویلی انداز میں دیا گیا تو وہ اطمینان بخش نہیں ہوگا، بلکہ اس کا جواب مورخانہ اور مبصرانہ انداز میں ڈھونڈنا پڑے گا، اس سلسلہ میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، اس زمانے کے علما میں قاضی ابو یوسف اور امام شیبانی تو پیدا ہوئے، وہ محدثین فقہا، اور مفتی بن کر عالم اسلام میں نمایاں رہے، مگر آخر وہ مدرسہ فیروز شاہی جیسے شاندار مدرسہ کو کیوں باقی نہیں رکھ سکے ؟ یا شاہ عبد الرحیم کی قائم کردہ درسگاہ کی تاریخ کو لمبی کیوں نہ بنا سکے ؟

کیا اس لیے کہ ان میں حرارت ایمانی تو ضرور رہی، مگر وہ اپنے کو فعال نہ بنا سکے وہ دعوت تو دیتے، مگر ان میں عزیمت نہیں رہی، وہ محراب و منبر کی زینت تو بنے رہے، مگر

ان میں تنظیمی اور تعمیری صلاحیتیں پیدا نہیں ہوئیں، وہ درس وتدریس دینے میں تو نادرۂ روزگار رہے، لیکن وہ حکومت یا عام معاشرے پر اس طرح اثر انداز نہیں ہو سکے کہ وہ ان مدرسوں کو قائم رکھتے، وہ اپنے عقائد میں بڑے راسخ اور پاکیزہ تو رہے، مگر دوسروں کے عقائد سے شاید ان کو ایسا اختلاف رہا کہ ان میں وہ باہمی یگانگت وموانست پیدا نہ ہو سکی، جو اپنے تعلیمی اداروں کو ایک باضابطہ تنظیم کے ساتھ موتیوں کی لڑیوں اور تسبیح کے دانوں کی طرح اس طرح ملائے رکھتے کہ ایک دوسرے کو بڑی تقویت پہونچتی رہتی اور جو مدرسے قائم ہوتے وہ ایسے چلتے رہتے کہ آج ان کا صد سالہ کیا بلکہ ہفت صد سالہ جشن منایا جاتا۔

مورخانہ تجزیہ کیا جائے تو ان مدرسوں میں جو تعلیم ہوتی رہی، ان سے حسب ذیل قسموں کے علما پیدا ہوتے رہے،

(۱) ایک قسم تو پاک طینت علماء کی تھی، جنھوں نے اپنے کردار کو ہر حال میں اعلیٰ اور اونچا رکھا، وہ دوسرے علماء کے لئے نمونہ بنے، مگر ایسے علماء یا تو گوشہ نشیں ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے یا تصنیف و تالیف میں وقت صرف کرتے۔

(۲) دوسری قسم میں وہ علماء تھے، جن کا مشغلہ درس وتدریس تھا، ان کے تلامذہ حصول تعلیم کے بعد ملک کے اطراف وجوانب میں پھیل جاتے، عوام میں اسلام کے نقیب ومحافظ ہوتے، ان ہی کی بدولت قَالَ اللّٰهُ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی صدائیں مختلف گوشوں میں بلند ہوتی رہتیں، مگر صرف محراب ومنبر کی زینت بننے ہی پر اکتفا کرتے، یا درس وتدریس میں لگ جاتے۔

(۳) تیسری قسم میں وہ علماء تھے، جو حکمران طبقہ کے معاون اور مددگار بن گئے۔ گوشہ نشین پاک طینت علماء ایسے علماء کو جاگیردار، دنیادار اور جاہ پرست کہتے، ان کا خیال تھا کہ جو علماء دربار سے وابستہ ہوتے ہیں، ان کا نام اللہ کی بارگاہ سے خارج ہوتا ہے، مگر حکمران طبقہ کے

معاون علماء کہتے کہ گوشہ عافیت میں بیٹھ کر عبادت وریاضت سے عاقبت تو ضرور سنور جاتی ہے، لیکن ملت نظر انداز ہو جاتی ہے۔

مدرسوں سے نکلے ہوئے، ان تینوں قسموں کے علماء کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ آخر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی زندگی میں جو تجدیدی کارنامے انجام دیئے، ویسے کارنامے ہر زمانہ میں کسی عالم نے تنہا نہیں تو مجموعی حیثیت سے کیوں نہیں انجام دیا، یا آخری زمانہ میں حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور سید اسمٰعیل شہیدؒ نے جس ایمانی ولولہ انگیزی سرفروشی، جانبازی اور قربانی کا ثبوت دیا، اس کی مثال صرف ایک ہی کیوں ہے۔

ہمارے علماء مسلمانوں کے دور حکومت میں برابر کڑھتے رہے، کہ مسلمان حکمرانوں کے طرز حکومت میں قیصر وکسریٰ کا فاسقانہ، اور فاجرانہ رنگ ہے، مگر وہ ان حکمرانوں کو خلفاء راشدین کے طرز حکومت کا عمل پیرا کیوں نہیں کرا سکے، کہا جا سکتا ہے کہ ان حکمرانوں کے قاہرانہ، جابرانہ اور خود غرضانہ طرز عمل کو قابو میں لانا ان کے بس کی بات نہ تھی مگر عوام کو اپنی دعوت وعزیمت سے اپنا ہمنوا اس طرح بنا سکتے تھے کہ یہ عوام غیر معمولی طور پر اچھے ہو جاتے، تو خواص وسلاطین بھی انکے رنگ میں رنگ جاتے، مگر عوام تو خود ان فاسق وفاجر حکمرانوں کے رنگ میں رنگتے چلے گئے، اس کی ذمہ داری کس پر آتی ہے، عوام کو مذہبی بنانا حکمران طبقہ کا کام نہیں، اس کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے، کیا وہ مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں اس ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہوئے؟ اس کا تجزیہ ناقدانہ طور پر کرنے کی ضرورت ہے، سلاطین وخواص کا برا ہونا کوئی تعجب انگیز نہیں، دولت وامارت کے ساتھ فسق وفجور کا آنا لازمی ہو جاتا ہے، مگر اس دور میں ہمارے مسلمان عوام کا معاشرہ صالح، توانا اور تندرست ہوتا تو شاید ان کے حکمرانوں کی سلطنت پر زوال نہ آتا، ہمارے علماء اپنے حکمرانوں کی حکومت سے بدظن ہو کر

خلافت راشدہ کے طرز حکومت کے خواہاں تو ضرور رہے، لیکن اس طرز حکومت کے لیے خلافت راشدہ کی معاشرت بھی پیدا کرنے کی ضرورت تھی، جو علماء و صلحا ہی کے ذریعہ سے پیدا ہو سکتی تھی، لیکن وہ محراب و منبر اور درس و تدریس کی رونق بنے رہنے ہی پر اکتفا کرتے رہے، احیائے دین اور تجدید یقین کے لیے جس اجتہاد، قوت محرکہ اور عزیمت کی ضرورت تھی، ان کو عمل میں نہ لاسکے۔

مسلمان بادشاہوں اور ان کے فوجی سرداروں میں شہاب الدین غوری نے ترائین کی جنگ جیت کر ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کی ایسی بنیاد ڈالی کہ وہ ساڑھے چھ سو برس تک چلی، بختیار خلجی نے مٹھی بھر فوج لے کر بہار اور بنگال کی تسخیر کی، علاء الدین خلجی کے دربار کا ایک خواجہ سرا ملک کافور فوجی سردار بن کر دہلی سے چلا تو پورے جنوبی ہند کو فتح کر کے اس کو سلطنت دہلی کے ماتحت کر دیا، اکبر نے راجپوتوں کے دلوں کی تسخیر کر کے پورے راجستھان کو اپنے قلمرو کا باجگذار بنا لیا، اورنگ زیب کے زمانے میں مسلمانوں کی حکومت کا پرچم کشمیر سے ارکان تک لہراتا رہا، ہندوستان کو اسی نے پہلی بار جغرافیائی وحدت عطا کی۔

ایسی مثالیں علماء کے طبقہ سے بھی ملنی چاہیے تھیں، وہ بھی اٹھتے اپنی تبلیغ و تلقین سے خطے کا خطہ اسلام کے دائرے میں لے آتے، وہ ایسا کسی وجہ سے نہ کر سکے تھے، تو کم از کم کوئی ایک ایسی شاندار درسگاہ بنا کر اس کو اپنے سینوں میں اس طرح لگائے رکھتے کہ یہاں سے اسوقت سے لیکر اب تک دینی علوم کا سوتا پھلا کرتا، مگر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مدرسے ختم ہونے کے لیے قائم کئے جاتے رہے،...... صبح الاعشیٰ میں ہے کہ دہلی میں تغلق کے عہد میں ایک ہزار مدرسے تھے، اس زمانہ میں بھی اسکا فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ ان میں کتنے واقعی دین کی تعلیم کی ترویج کی خالص نیت سے، کتنے دینی اور فقہی اختلافات کی بنا پر، کتنے باہمی رقابت اور کتنے ذاتی جلب منفعت کی خاطر قائم ہوئے تھے، ان میں سے کسی کی بھی

تاریخ لمبی ہوتی، تو وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی علوم و فنون کی ترویج کا بہت بڑا قلعہ بنا رہتا۔

جب تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں رہی، اس کی سرپرستی میں دینی مدارس کے پھلنے پھولنے کا پورا موقع تھا، یہاں کے فارغ شدہ علماء اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں اسی قسم کی تنظیم قائم کر سکتے تھے، جو برطانوی حکومت کے زمانے میں عیسائی مبلغوں نے پورے ملک میں کی تھی، مگر وہ یہ بھی نہ کر سکے، یہ صحیح ہے کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت علمائے کرام ہی کی بدولت وجود میں آئی، مگر دہلی سے بنگال تک جو علاقے ہیں، ان میں مسلمانوں کی اکثریت کیوں نہیں ہو سکی، دہلی اور اس کے اطراف و جوانب میں بزرگان دین کے مزارات قدم قدم پر ملیں گے، مگر یہ علاقے پورے طور پر اسلام کی شمع سے منور کیوں نہیں ہو سکے؟ یہ صحیح ہے کہ یہ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے تو نہ ہو سکے، لیکن ان ہی علاقوں سے دینی علوم کا سرچشمہ پورے ہندوستان میں بہتا رہا، اور اب بھی بہہ رہا ہے، مگر جب یورپ میں محققین اور مفکرین ہر قسم کے علوم و فنون پر کتابیں لکھ کر نئے نظام حیات اور نئی فکر و نظر سے اپنی قوموں کو روشناس کر رہے تھے، تو ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کیا ہمارے علماء ہم کو اپنی ایسی ہی تصانیف دے رہے تھے؟ انھوں نے اس زمانے میں کتابیں ضرور لکھیں، لیکن ان سے عام مسلمان زیادہ مستفید نہیں ہو سکے، وہ جو کچھ لکھتے ایک خاص طبقہ تک محدود رہتا۔ جو خود تو ان کو پڑھ کر سمجھ لیتا، مگر عوام کو سمجھانے میں قاصر رہا، اسلئے ایسے علماء کی نظری و فکری چیزیں زیادہ نہیں پھیل سکیں، ان میں زیادہ تر تقلید ہی کے قائل ہوئے، اس تقلید جامد کا روشن پہلو یہ ضرور رہا کہ مسلمانوں کی مذہبی غیرت اور دینی حمیت ایسی برقرار رہی کہ وہ غیر مسلموں کے تصورات سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے، اور ان کی انفرادیت مٹ نہ سکی، مگر اس انفرادیت کو جاندار بنائے رکھنے میں معاشرہ کے نئے جائز تقاضوں کی تکمیل کی خاطر جس مجتہدانہ فکر اور عزیمت بالعمل کی

ضرورت تھی وہ بروئے کار نہیں آتی رہیں۔

ایک بات اور اس زمانہ کے مدرسوں سے جو علماء پیدا ہوئے، کیا انھوں نے ہندوستان جیسے ملک میں اسلام کے رب کو رب المسلمین یا رب العالمین، اور پھر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ المسلمین یا رحمۃ اللعالمین بنا کر پیش کیا؟ ہم خود سوچیں کہ ہمارے علماء نے ان میں سے کون سا رنگ اختیار کیا، پاک طینت علماء کے یہاں تو بڑی رواداری اور فراخدلی رہی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض علماء نے اپنی انتہا پسندی میں ایسی اشتعال انگیز تحریریں لکھیں جن سے رب العالمین رب المسلمین اور رحمۃ اللعالمین رحمۃ المسلمین ہی سمجھے گئے، اس سے اسلام کی تبلیغ میں وہ فروغ حاصل نہیں ہو سکا! جو ہونا چاہیے تھا۔

اگر ہمارے علماء بالعزم اور بالجزم ان ہی باتوں پر عمل کرتے رہتے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے نجران کے عیسائیوں کے لیے روا رکھا تھا، تو کیا عجب کہ اس رواداری، فراخدلی اور سیر چشمی سے اس ملک میں ہماری تاریخ کچھ اور ہوتی، اس سے انکار نہیں کہ علماء اور صوفیائے کرام ہی کی بدولت اسلام ہندوستان کی سرزمین میں سرسبز اور شاداب ہوا، مگر ہماری محرومی یہ بھی ہے کہ انھوں نے یہاں کے لوگوں کے دلوں کے تسخیر کے لیے جو روادارانہ اور فراخدلانہ اقدام کئے، ان کی تاریخ قلمبند نہیں کی گئی، اس کے بجائے ان کے باہمی اختلافات اور تنازعات کو زیادہ نمایاں کیا گیا،

ماضی کی باتیں اس لحاظ سے قابل اعتنا ہوتی ہیں، ان سے حال میں درس لے کر مستقبل کو سنوارا جا سکتا ہے، ماضی میں اسلامی درسگاہوں سے نکل کر ہمارے علماء نے جو روشن کارنامے انجام دیئے ان کی تو ہم قدر کرنا سیکھیں، مگر ان سے جو کسی وجہ سے کوتاہی ہوئی اس کی تلافی موجودہ دور کی اسلامی درسگاہوں کے علماء ہی کو کرنا ہے، کیونکہ ان سے جو علماء نکلتے ہیں

وہی صحیح معنوں میں اسلام کے نگہبان اور پشتیبان ہوتے ہیں، موجودہ دور میں ذہنی ارتداد، لادینی تصورات اور گمراہ کن نظری اور فکری تخیلات کا بے پناہ لشکر آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے، ان کے خلاف مقدس ترین جہاد کرنے کے لیے ہمارے مدرسوں ہی میں سرفروش اور جانباز مجاہدین تیار ہو سکتے ہیں، لیکن اگر ان کو محراب کی امامت ہی پر اکتفا کرنا ہے، تو پھر دعاء ہے کہ

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہو ملت کی زندگی کا پیام

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون پر اور جگہوں کے مقابلہ میں کم کام نہیں ہوا ہے، ان تمام علوم پر ہندوستانی علماء اور مصنفین کی بہترین کتابیں موجود ہیں، لیکن ان کی کوئی جامع فہرست موجود نہیں تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مولانا حکیم سید عبد الحئی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء نے الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند کے نام سے ایک مفید کتاب مرتب کی تھی جس کو شام کے مشہور علمی ادارے مجمع العلمی العربی دمشق نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، یہ اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس میں ہندوستانی علماء کی تصانیف کے ساتھ مسلمانوں کی مکمل علمی و تعلیمی و ذہنی و فکری تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

مترجمہ مولانا ابو العرفان ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء

ضخامت :-　　قیمت : ۲۵ روپے

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں :-　　قیمت : ۱۰ روپے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث (الجزء الثالث) مرتبہ مولانا حافظ محمد یوسف کوکن صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ وطباعت عمدہ، کتابت ٹائپ، صفحات ۴۸۴، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: حافظ ہاؤس پرنٹرز اینڈ پبلشرز ۱۳ حارہ میلا پور، مدراس ۱۴،

مولانا حافظ محمد یوسف کوکن نے عربی زبان وادب کے جدید شعراء و مصنفین کے حالات وسوانح کی ترتیب واشاعت کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس کی دو جلدیں پہلے چھپی تھیں، جن پر معارف میں ریویو کیا جا چکا ہے، یہ تیسری جلد ہے جو چھیالیس اصحابِ شعر وادب کے تراجم پر مشتمل ہے، ان میں چند کا انتقال اس صدی کے ربع اول میں ہوا ہے لیکن زیادہ ایسے لوگ ہیں، جن کا انتقال اس صدی کے نصف اول میں ہوا ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جن کی وفات ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان ہوئی، لائق مصنف نے ان اصحابِ علم وادب کے حالات وواقعاتِ زندگی قلمبند کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی علمی، ادبی، تنقیدی، شعری، سیاسی اور سماجی خدمات پر مفید بحث وتبصرہ بھی کیا ہے اور ان کے ادبی کارناموں کی اہمیت بھی دکھائی ہے، اس کتاب میں جن لوگوں کا ترجمہ شامل ہے، ان میں بعض اہم اور قابل ذکر نام یہ ہیں: احمد لطفی السید، شیخ مصطفےٰ صادق رافعی، عبدالرحمن شکری، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، ڈاکٹر احمد امین، ڈاکٹر زکی مبارک، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، عباس محمود عقاد، توفیق الحکیم، ڈاکٹر احمد حسن زیات، خیر الدین زرکلی، خلیل مردم بک، شفیق جبری، حسن البنا اور سید قطب وغیرہ، ان میں اکثر مصنفین کی تصنیفات کے اردو ترجمے بھی ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اردو داں طبقہ ان کے ناموں سے واقف ہے، اس جلد میں متعدد ایسے شعراء اور اہل قلم کا ذکر ہے جن میں دینی، ادبی، تنقیدی اور تاریخی مسائل پر باہم بحث و

مباحثہ رہ چکا ہے، جس کا ذکر مصنف نے ان کے ترجمے میں کیا ہے، اس کتاب میں جہاں دینی حیثیت سے ممتاز بعض لوگوں کا تذکرہ ہے، وہاں بعض ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے جن پر الحاد و زندقہ کا الزام عائد کیا گیا ہے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین ان ہی لوگوں میں ہیں، مصنف نے ان کے متعدد ایسے خیالات نقل کئے ہیں، جن کی وجہ سے اصحاب علم و دین نے ان پر سخت نکتہ چینی کی ہے، مثلاً آزادیٔ نسواں کی حمایت، پردہ کی مخالفت، وطن ودین کی تفریق، حکومت کی اساس دین کے بجائے عربی قومیت کو قرار دینا اور اپنی تصنیفات الشعر الجاہلی اور الادب الجاہلی میں جاہلی شعر وادب کو منحول ثابت کرنا وغیرہ، فاضل مصنف نے بڑی محنت اور سلیقہ سے موجودہ دور کے ممتاز عربی ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور کارناموں کے بارہ میں مفید اور دلچسپ معلومات جمع کئے ہیں، ان کو اردو کی طرح عربی لکھنے کا اچھا ملکہ ہے، اس کتاب سے عربی زبان وادب پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ عربی زبان وادب کے اصحابِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

قرآن مجید اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ مرتبہ جناب رشید احمد جالندھری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت نہایت عمدہ، صفحات ۱۷۲، قیمت ۲۰ روپے، ناشر جامعہ بلوچستان کوئٹہ

بلوچستان یونیورسٹی میں پندرہویں صدی ہجری کے استقبال کی مناسبت سے "قرآن مجید اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ ہے" کے موضوع پر ایک علمی مذاکرہ منعقد ہوا تھا، یہ کتاب اس میں پڑھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں تین اردو اور دوسرے میں تین انگریزی مضامین شامل ہیں، اردو حصہ کی ابتدا میں جامعہ بلوچستان کے سربراہ آغا اکبر شاہ کی افتتاحی تقریر اور مولانا محمد طیب مرحوم مہتمم دار العلوم دیوبند کا پیغام بھی درج ہے، اس حصہ کا اہم اور مبسوط مضمون خود فاضل مرتب کا ہے، انھوں نے شریعت اور قانون کی وسعت وہمہ گیری، اجتماعی زندگی میں ان کی اہمیت اور ان کے بنیادی مقصد پر بحث کرکے موجودہ زمانہ میں اسلامی قوانین کا از سر نو جائزہ لینے کی دعوت دی ہے، اور اس سلسلہ میں اجتماعی زندگی کو پورے طور پر قرآن اور اسلام کی اخلاقی و اجتماعی قدروں کی بنیاد پر استوار کرنے کی ضرورت واضح کی ہے، مولانا محمد طاسین مجلس علمی کراچی کے مقالہ "قرآن مجید کا تصور معاشرہ" میں پہلے اجتماعیت و انفرادیت

کے بارہ میں قرآن کے تصورات پیش کئے گئے ہیں اور آخر میں ان خصوصیات کا ذکر ہے، جو قرآن نے معاشرہ کی بتائی ہیں، ڈاکٹر صغیر حسن معصومی نے چودھویں صدی ہجری میں لکھی جانے والی مندرجۂ ذیل اہم اردو تفسیروں کا مختصر تعارف کرایا ہے: (۱) ترجمان القرآن (مولانا ابوالکلام آزادؒ) (۲) تفہیم القرآن (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ) (۳) معارف القرآن (مولانا مفتی محمد شفیعؒ) (۴) تفسیر معارف القرآن (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) (۵) تدبر قرآن (مولانا امین احسن اصلاحی) (۶) ترجمہ و تفسیر (مولانا عبدالماجد دریابادیؒ) انگریزی مضامین کے عنوانات یہ ہیں: (۱) قرآن مجید کا فلسفیانہ پہلو (پروفیسر منظور احمد کراچی یونیورسٹی) (۲) قرآن مجید میں عمل صالح کا تصور (پروفیسر سید حسین جعفری، بیروت یونیورسٹی) اسمائے حسنیٰ اور آج کا انسان (آر۔اے۔بٹلر) شروع میں فاضل مرتب نے قرآن مجید کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے اور اس کی بنیادوں پر نئے معاشرہ کی داغ بیل ڈالنے کی پُراثر دعوت دی ہے، یہ سب مضامین غور و فکر سے لکھے گئے ہیں اور مطالعہ کے لائق ہیں۔

کردار کے غازی قاضی محمد عدیلؒ

مرتبہ ڈاکٹر اختر بستوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۵۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۰ روپے، پتے: (۱) مرزا اینڈ سنس، ریتی کا پل، گورکھپور (۲) دانش محل، بکسیلرز، امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

یہ کتاب مشہور قومی و ملی کارکن، بستی کے کامیاب وکیل اور اردو کے اچھے خطیب و اہل قلم قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم پر اُن مضامین کا مجموعہ ہے، جو ان کی وفات کے بعد مختلف اخباروں اور رسالوں کے علاوہ ان کی پہلی برسی کے موقع پر بستی کے ہفتہ وار اخبار "بستی کی آواز" کے قاضی محمد عدیل عباسی نمبر میں شائع ہوئے تھے، اب ڈاکٹر اختر بستوی استاد شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے عام فائدہ کے لئے اہم مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے، شروع میں انھوں نے قاضی صاحب کے اہم واقعات سنہ وار درج کئے ہیں، اس میں ان کی تصنیفات کی فہرست بھی دی ہے، ایک اور تحریر میں قاضی صاحب کے والد بزرگوار کی بیاض سے قاضی صاحب کی صحیح تاریخ پیدائش نقل کی گئی ہے، اس کے بعد مختلف اہل قلم کے ۲۲ مضامین درج ہیں،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، علی جواد زیدی، حیات اللہ انصاری اور ڈاکٹر محمود الٰہی کے مضامین بھی اس کتاب کی زینت ہیں، قاضی صاحب کے عزیزوں میں ان کے دونوں بھائیوں مولانا شکیل عباسی ندوی اور قاضی جلیل عباسی، خویش محمد حامد علی، فرزند قاضی محمد ارشد عباسی اور احباب میں ڈاکٹر ہنومان پرشاد سری واستوا اور حکیم ابوالکلام کے مضامین سے ان کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، جناب خلیل الرب کا مضمون خاص طور پر پسند آیا، دوسرے مضامین بھی اچھے ہیں، آخر میں شعرا کا منظوم خراج عقیدت درج ہے، قاضی صاحب بڑے عملی آدمی اور سچ مچ کردار کے غازی تھے، وہ فرقہ واریت، اردو اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارہ میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف عمر بھر جہاد کرتے رہے، اور اتر پردیش میں دینی تعلیمی تحریک کی تاسیس و تشکیل ان کا بڑا کارنامہ ہے، انھوں نے قوم پروری اور حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہونے کے باوجود اپنی ایمانی غیرت اور ملی حمیت پر آنچ نہیں آنے دی، اس کتاب میں ان خصوصیات کے علاوہ ان کے خاندانی حالات، تعلیم، قومی، ملی و سیاسی مشاغل، تحریر و تصنیف اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جس کا مطالعہ مفید اور سبق آموز ہے، مگر یہ کمی رہ گئی ہے کہ ان کی مطبوعہ تصنیفات کا سنہ اشاعت اور غیر مطبوعہ کا سنہ تصنیف نہیں دیا ہے۔

پٹھان شاعرات کا تذکرہ

مرتبہ ڈاکٹر خان محمد عاطف خاں، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲۲، قیمت تحریر نہیں، پتے: (۱) ڈاکٹر خان محمد عاطف، ۲۲/۳۔ اسٹیشن روڈ، لکھنؤ، (۲) صدیق بکڈپو، امین آباد، لکھنؤ۔

ڈاکٹر خان محمد عاطف لکچرر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی نے اس کتاب میں ۲۸ پٹھان شاعرات کا تذکرہ قلمبند کیا ہے اور ان کا نمونہ کلام بھی دیا ہے، ڈاکٹر صاحب ملیح آباد کے پٹھان خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس کتاب میں چند ملیح آبادی خواتین کا ذکر بھی ہے، شروع میں دیباچہ اور معلومات پر مشتمل مقدمہ بھی ہے، دیباچہ میں عورتوں کی اہمیت، اور سماجی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے اسلام کی بعض ہدایات پیش کی گئی ہیں، مصنف نے

پٹھانوں کی خصوصیات بیان کرکے دکھایا ہے کہ وہ صاحب شمشیر وسنان ہونے کے ساتھ علم وفن کے خدمت گذار بھی تھے، جس کا ثبوت پٹھان عورتوں کی شاعری ہے کیونکہ جب ان کے ذوقِ شعر وسخن کا یہ حال ہے تو مرد بھلا اس میں کیسے پیچھے رہ سکتے تھے اس سلسلہ میں پٹھانوں کی اصل زبان پشتو اور فارسی بتا کر ان دونوں میں خواتین کی شاعری کے نمونے دیئے ہیں، اور پٹھان شاعری کے مزاج وخصوصیات پر بھی گفتگو کی ہے، مقدمہ میں پٹھانوں کی مختصر تاریخ اور ہندوستان میں ان کی سیاسی وسماجی خدمات کا ذکر ہے، مصنف نے پٹھانوں کے آرین ہونے کی تردید کی ہے اور انھیں نسلاً اسرائیلی قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں آریوں کے متعلق ضروری معلومات تحریر کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ نسل وقوم کے بجائے مذہب وعقیدہ کی بنیاد پر آریہ کہلاتے تھے، اصل تذکرہ مختصر ہے، اکثر خواتین کی ولادت و وفات کے نہ سنین کا ذکر ہے اور نہ کلام پر سیر حاصل تبصرہ، مصنف نے دیباچہ میں اس اختصار کی کوئی وجہ نہیں لکھی ہے، تاہم انھوں نے ایک انوکھے موضوع کا انتخاب کرکے اور اس پر اس قدر مواد جمع کرکے بھی اپنے ذوق، محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے، جا بجا کتابت وطباعت کی غلطیاں بھی ہیں، متعدد الفاظ کا املا بھی درست نہیں ہے، جیسے مورخ علمی ص۲۲ (عجمی) نصب ص۶۲ (نسب) اثبات ص۸۲ (اسباط) لاتمنوا ص۱۳۵ (لاتمنعوا) دقائق ص۱۳۶ (حقائق یا دقائق) خلقت ص۱۵ (خلعت) ص۱۲۹ پر دو عربی شعر بالکل غلط تحریر کئے گئے ہیں، ص۱۶۱ پر "قرآن پاک کی مبارک الفاظ" لکھا ہے اور ص۱۳۶ پر واقف کا لفظ بالکل غلط استعمال ہوا ہے، لکھتے ہیں "آج مرحومہ دنیائے ادب میں ز۔خ۔ش کے نام سے واقف ہے۔

مکاتیب نگم مرتبہ جناب محمد ایوب واقف صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۸۴، مجلد، قیمت ۲۰ روپیہ، پتے: (۱) انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر نئی دہلی، (۲) محب بکڈپو، بھنڈی بازار، بمبئی (۳) نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

اردو کے محب وشیدائی اور بے لوث خدمت گذار منشی دیانرائن نگم کی زندگی رسالہ زمانہ کے لئے وقف ہوگئی تھی، جس نے نصف صدی تک قوم وملک کی ذہنی ودماغی تربیت اور اردو زبان وادب کی زریں خدمت

کے علاوہ اردو کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی شہرت میں چار چاند لگائے، دیانرائن نگم کے اپنے دور کے مشاہیر اور اچھے اہل قلم سے مخلصانہ روابط تھے، اس لئے ان سے ان کی برابر خط وکتابت رہتی تھی، مگر ابھی تک نہ ان کے خطوط کا کوئی مجموعہ چھپا ہے اور نہ اس کی توقع ہی تھی کیونکہ ان کی وفات کو طویل عرصہ گذر چکا ہے اور جن لوگوں کو وہ خطوط لکھتے رہے ہیں ان میں سے اکثر لوگ بھی اب موجود نہیں رہ گئے ہیں، مگر جناب محمد ایوب واقف کی محنت وکوشش سے منشی جی کے ۹۰ خطوط کا یہ مجموعہ شائع ہوا ہے، جس کے لئے وہ اور منشی جی کے فرزند اور اس مجموعہ کے ناشر جناب برج نرائن نگم اردو زبان وادب کے قدردانوں کی تحسین کے مستحق ہیں، منشی جی کی تحریریں سلیس اور شگفتہ ہوتی تھیں، یہ خطوط اس کا نمونہ ہیں، ان سے اردو زبان اور رسالہ زمانہ سے ان کے عشق، رسالہ کے معیار کو بلند کرنے کی فکر، اس کی ترتیب میں غیر معمولی محنت ودماغ سوزی، نوجوان اور ہونہار ادیبوں کی تربیت اور حوصلہ افزائی اور مشاق اہل قلم کی قدردانی کا پتہ بھی چلتا ہے اور بعض اہل قلم نیز اردو انجمنوں اور تحریکوں کے بارہ میں ان کے خیالات اور زبان وادب کی بعض مفید باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں، شروع میں ایک مقدمہ میں خطوط نگاری کی ادبی اہمیت، منشی جی کے خطوط کی خصوصیات اور ان کی خدمات ادب پر اچھی بحث کی گئی ہے، آخر میں ان لوگوں کا مختصر حال تحریر کیا ہے جن کے نام کے خطوط اس مجموعہ میں درج ہیں اور مکاتیب میں جن لوگوں کا ذکر آگیا ہے ان پر مختصر توضیحی حواشی بھی دیئے ہیں، واقف صاحب کو لکھنے پڑھنے کا شوق اور لگن ہے، مگر ابھی وہ نوجوان ہیں اس لئے ہلکے پھلکے کاموں پر محنت ومطالعہ کو ترجیح دینا اور کمیت سے زیادہ کیفیت کا خیال رکھنا چاہئے، تاکہ ان کی تحریر گہرائی اور گیرائی سے خالی نہ رہے۔

بین السطور از جناب صبیح محسن صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۰۸، مجلد مع گردپوش، قیمت بیس روپے، پتہ: مکتبہ جمال، ۱۴۱، شرف آباد، کراچی۔

یہ جناب صبیح محسن کے ایک درجن سے زیادہ مختصر مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، اس سے طنز ومزاح سے ان کی طبعی مناسبت اور فطری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، لائق مصنف نے موجودہ ماحول کی متعدد

ایسی معیوب باتوں کی ظریفانہ انداز میں نشاندہی کی ہے جن کا روزمرہ زندگی میں برابر مشاہدہ کیا جاتا ہے، انھوں نے اس میں سوسائٹی کے مختلف طبقوں کو اپنا موضوع بنایا ہے، جیسے مصنف، شاعر، صحافی، ڈاکٹر بینک منیجر، انجینیر، میاں بیوی، وزیر اور ان کی بیگم، مالک مکان و کرایہ دار، افسر و ماتحت، چندہ لینے اور دینے والے وغیرہ، ان کے علاوہ تفوق اور سماجی برتری کے خواہشمند، سستی شہرت کے آرزومند، نمود و نمائش پسند لوگوں کے خط و خال بھی نمایاں کئے ہیں، اور وقت کے معاملہ میں بے پروا لوگوں کا خاکہ بھی کھینچا ہے، مصنف کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مضحک پہلوؤں کا جوڑ واقعات سے ملا دیا ہے، ان کا طنز و مزاح مصنوعی نہ ہونے کے باوجود اپنے اندر افسانے جیسا لطف رکھتا ہے، انداز شائستہ متین اور ابتذال و رکاکت سے خالی ہے، اس مجموعہ سے مصنف کے احساس و مشاہدہ کی قوت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، در اصل انھوں نے موجودہ سماج کی مختلف خامیوں اور کمزوریوں کی ایسے شگفتہ انداز میں لفظی تصویر کھینچی ہے کہ قاری کیف و سرور اور فرحت و انبساط بھی حاصل کرتا ہے اور اسے موجودہ عام اور ہمہ گیر پست ذہنیت اور غیر شریفانہ انداز کی قباحت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، شروع میں پاکستان کے مشہور اہل قلم مشفق خواجہ صاحب نے مصنف اور تصنیف کا نہایت ظریفانہ انداز میں تعارف کرایا ہے جو ان کی خوش ذوقی و خوش طبعی کا ثبوت ہے، کتاب کے مصنف کو دلپذیر اردو میں انداز بیان کی شگفتگی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا جو سلیقہ ہے، امید کہ اس کا صحیح معرف برابر لیتے رہیں گے، اور جہاں رہیں وہاں کے حلقے میں نمایاں حیثیت حاصل کریں گے، کتاب کا نام موجودہ مذاق کی ترجمانی ضرور کرتا ہے، مگر اس سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ نہیں ہوتا، اس سے پہلے کے مزاح نویس اور طنز نگار اپنی تصانیف کے جو نام رکھتے، ان سے ان کے نقش تحریر کا اظہار مطالعہ سے پہلے ہو جایا کرتا تھا۔

"ض"

جلد ۱۳۴ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۴ء عدد ۴

مضامین

ایک ضروری اطلاع

کاغذ کی ہوشربا گرانی کی وجہ سے دار المصنفین کی مطبوعات کی قیمت میں یکم اکتوبر ۸۴ء سے بیس فیصدی کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اور معارف کا سالانہ چندہ بھی جنوری ۸۵ء سے ہندوستان کے لیے تیس روپے، اور بیرون ہند کے لیے ساٹھ روپے کر دیا گیا ہے، امید ہے کہ دار المصنفین اور معارف کے قدردان اس معمولی اضافہ کو بطیب خاطر گوارا کریں گے۔

"منیجر"